سلمان رشدی

بھوتوں کے آسیب میں

☆

مصنف: محمد ارشد احمدی

مترجم: محمد زکریا ورک

Salman Rushdie, Haunted by his unholy Ghosts

by: Mohamed Arshad Ahmedi

(Urdu Translation)

Translated into urdu by :

Muhammad Zakariyya Virk (Law Graduate Karachi), Canada

& Chaudhry Muhammad Idris, MA; M.Ed; (USA)

First Published in UK in 2007

Published by :

Islam International Publications Limited
Islamabad, Sheephatch Lane
Tilford, Surrey GU10 2AQ
United Kingdom

Printed in UK at:

Raqeem Press, Tilford, Surrey

ISBN: 1 85372 947 7

فہرست مضامین

پیش لفظ

سلمان رشدی کا رسوائے زمانہ ناول آج سے اٹھارہ سال قبل لندن سے شائع ہوا تھا۔اس کا جواب سیّدنا حضرت مرزا طاہر احمد صاحب خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ کی زیر ہدایات ونگرانی جماعت احمدیہ برطانیہ کے محمد ارشد احمدی نے 1996ء میں لکھا تھا۔اب اس مدلّل کتاب کا اردو ترجمہ پیش کیا جارہا ہے جو سیّدنا حضرت مرزا مسرور احمد خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کے زیر ارشاد کیا گیا ہے۔ یہ ترجمہ محمد زکریا ورک صاحب (کینیڈا) نے بڑی محنت سے کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اردو پڑھنے والے اس سلیس آسان فہم ترجمہ سے حسب توفیق متمتع ہوں گے اور اس کی اشاعت اور ترسیل پوری دنیا میں بڑے وسیع پیمانہ پر کی جائے گی۔ ترجمہ کی نظر ثانی اور پروف ریڈنگ میں خاکسار کی مدد عبدالسلام ظافر صاحب، مرزا محمود احمد صاحب، امۃ العلی زینوبیہ احمد صاحبہ، صبیحہ لون صاحبہ اور فریدہ خان صاحبہ نے کی ہے۔ ابتدائی طور پر ٹائپنگ کینیڈا کے ابوذیشان صاحب نے کی جبکہ ٹائپ سیٹنگ محمود احمد ملک صاحب نے بڑی محنت سے کی ہے۔

اللہ تعالیٰ مصنف، مترجم اور جملہ احباب کو جنہوں نے اس کتاب کی تیاری میں خدمت کی توفیق پائی ہے، جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین

خاکسار
منیر الدین شمس
ایڈیشنل وکیل التصنیف، لندن

جولائی 2007ء

اظہار تشکر

میں دل کی گہرائی سے عالمی جماعت احمدیہ کے سربراہ خلیفۃ المسیح الرابع حضرت مرزا طاہر احمد ایدہ اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوں جن کو مجھ پر اعتماد تھا اور انہوں نے میرے ذمہ یہ ریسرچ کا کام سپرد فرمایا۔ انہوں نے مسلسل میری رہنمائی فرمائی جس کی مجھے اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے بے انتہاء ضرورت تھی اور جس سے مجھے بہت حوصلہ ملتا تھا۔

نیز رضوان مرزا کا شکر گذار ہوں جنہوں نے ابتدائی ریسرچ کی۔ اسی طرح مسز شوکیہ میر، تنویر کھوکھر، سفیر بھٹی کا جنہوں نے تکنیکی اور ماہرانہ رائے سے مدد کی۔ اور ہمیشہ مسکراتے ہوئے ولید احمد جنہوں نے بے انتہا کارآمد مدد سے اس کام میں حصہ لیا کا بھی شکر گذار ہوں۔ فرید احمد اور فضل شاہد احمد خاص طور پر میرے شکریہ کے مستحق ہیں جنہوں نے کئی مواقع پر شوق سے راتوں کو جاگ کر اپنی کارآمد رائے اور تکنیکی معلومات کی مدد سے اس کام کو اختتام تک پہنچایا۔

فضل نے اپنی خدمات سے میری رائے کے مطابق پوری طرح سے یہ ثابت کر دیا کہ اس کی زندگی کا حصول صرف ومبلڈن فٹ بال کلب ہی نہیں ہے۔

ارشد احمدی

تعارف

جب سلمان رشدی نے اپنا نام نہاد ناول 1988ء میں شائع کیا تو اس سے دنیا بھر میں ایسی نزاعی بحث چھڑ گئی جس کی مثال ملنا محال ہے۔اس ناول میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا تھا ان کے خلاف لوگ گلیوں میں دیوانہ وار نکل آئے، جلوس نکالے گئے۔ ناول کے مضامین سے عوام الناس میں جس قسم کے شدید ردعمل کا اظہار رہوا، اس کے پیش نظر بعض مظاہرے اشتعال انگیزی پر منتج ہوئے جس سے متعدد لوگ یا تو زخمی ہوئے یا پھر ہلاک ہو گئے۔

دنیا بھر کے مسلمان ممالک نے اس ناول کی اشاعت کو مذموم قرار دیا اور ایران کے آیت اللہ خمینی نے رسوائے زمانہ فتویٰ جاری کیا،جس سے مغربی اقوام کا ردعمل شدید مخالفت اختیار کر گیا۔انہوں نے اس کتاب کی تائید میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔اس سے ملتا جلتا ردعمل برطانیہ میں ہوا جہاں یہ کتاب شائع ہوئی تھی۔ برطانوی انتظامیہ نے یہ کہہ کر لا چاری کا اظہار کر دیا کہ انہوں نے آزادی تقریر کے حق کا بہر صورت تحفظ کرنا ہے۔یوں اس بودی دلیل کی آڑ میں انہوں نے "Spy catcher" والے سیکنڈل کو بڑی آسانی سے نظر انداز کر دیا اور بعد ازاں برطانیہ میں فحش چینل والے ٹیلی ویژن کی آنے والی سٹیلائٹ ٹرانسمشن پر پابندی عائد کر دی۔ جہاں تک برطانوی انتظامیہ کا تعلق ہے یوں لگتا ہے کہ ائیر ویوز پر فحش زبان کی ٹرانسمشن سے اس کے مقدس اصول آزادی تقریر کی خلاف ورزی ہوتی تھی لیکن فحش زبان کی اشاعت جس کا واحد مقصد معزز ہستیوں کے خالص کیریکٹر پر گند اچھالنا تھا،جس سے ہزاروں شہریوں کے دل دکھے، ان کو آزردہ خاطر کرنے سے کوئی حق تلفی نہ ہوئی۔

پھر زخموں پر نمک چھڑکنے کے مترادف، اس ناول کو ادب کا بہترین نمونہ قرار دے کر اس کی منادی کی گئی، بلکہ اس کو مشہور زمانہ بکر ایوارڈ (Booker Award) کے لئے نامزد کیا گیا۔ مصنف کا استقبال ہیرو کے طور پر کیا گیا، اور اس کی رسوائے زمانہ کتاب میں سے اقتباسات

اجلاسوں میں پڑھ کر سنائے گئے۔

جب مسلمانوں نے احتجاج کیا تو ان پر غیر رواداری اور عہد وسطیٰ کی ذہنیت کے مالک ہونے کی مہر تصدیق لگائی گئی۔ سلمان رشدی کی کتاب کو بریڈفورڈ (برطانیہ) میں نذرآتش کرنے پر معاملہ اور بھی بگڑ گیا۔ کیونکہ میڈیا نے اس کو موضوع بحث بنالیا اور اس واقعہ کے مناظر کی فلم کو بار بار دکھایا گیا۔ اس بات نے مغرب میں مقیم مسلمانوں کے جذبات کو بھڑکایا اور وہ طبقہ جو پابندیِ قانون کے ساتھ پرامن طور پر رہا تھا، اگلی کئی دہائیوں کیلئے اس کا رجحان جارحانہ اور متحاربانہ ہوگیا۔

چنانچہ برطانیہ کے مسلمانوں نے جب عدالتوں میں جاکر دادرسی کی تو ان کی مصالحتی کوششیں روز اول سے ہی ناکامی کا منہ تک رہی تھیں۔ ایک ایسے معاشرہ میں جہاں کئی مذاہب کے پیروکار بستے ہوں، خدا کی شان میں گستاخی، برطانوی قوانین بادی الرائے میں صرف اہل نصاریٰ کے جذبات مجروح ہونے سے بچانے کیلئے بنائے گئے ہیں نہ کہ دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کیلئے، بالخصوص مسلمانوں کے لئے تو قطعاً نہیں۔

یہ کہنے کی ضرورت درپیش نہیں آتی جب اس کتاب کو اتنی شہرت ملی تو یہ راتوں رات سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتاب بن گئی۔ کئی ممالک میں اس پر پابندی عائد ہونے کے باوجود پہلے سال ہی میں صدہا اور ہزارہا کی تعداد میں بک گئی۔ اشاعتی ادارہ وائیکنگ (Viking) کی تاریخ میں یہ سب سے زیادہ بکنے والی کتاب بن گئی۔ بہرکیف سلمان رشدی کی قسمت سربہ مہر ہوگئی۔ کتاب کے مخالفین کی طرف سے دھمکیوں اور دشمنی کے جذبات نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ روپوش ہو جائے اور پہلے دوسال میں اس کو اپنا گھر 54 مرتبہ بدلنا پڑا۔ تاہم اس کی انگشت نمائی ہوئی اور اسے آزادی اور آزادی تقریر کے نمائندہ کے طور پر پیش کیا جانے لگا۔ برطانوی حکومت نے اس کی حفاظت کے لئے ٹیکس ادا کرنے والے عوام کے پیسے کو بے دریغ استعمال کیا۔ امریکہ کے صدر اور برطانیہ کے وزیراعظم سے اسے خصوصی ملاقات کا موقعہ دیا گیا۔

اگر ایک طرف رشدی کے خلاف مسلمانوں کا رویہ دیکھا جائے اور دوسری طرف اہل مغرب کا ردعمل تو دونوں میں ایک نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ "رشدی، بھوتوں کے آسیب میں"

ان دونوں کے درمیان کا راستہ اختیار کرتی ہے۔ ارشد احمدی صاحب کی کتاب اہل مشرق کی انتہا پسندی کو رد کرتی اور اہل مغرب کے رویہ کی مذمت کرتی ہے۔ یہ ہمیں بتاتی ہے کہ جہاں تک فتویٰ جاری کرنے کا تعلق ہے اس کا جواز اسلامی تعلیمات میں کہیں نہیں ملتا۔

اہل مغرب کے رویہ کی مذمت کرتے ہوئے ارشد احمدی صاحب ایک قدم اور آگے گئے ہیں تا کہ اس سارے معاملہ میں مغرب کے شر انگیز کردار کو بے نقاب کیا جا سکے۔ مصنف نے خوب واضح کیا ہے کہ جذبات مجروح کرنے والے اس نوع کے ناول کی اشاعت کوئی الگ تھلگ واقعہ نہیں ہے۔ بلکہ اسلام اور بانی اسلام ﷺ کے خلاف نفرت کا نتیجہ ہے جو آغازِ اسلام سے لے کر گذشتہ چودہ صدیوں سے بھڑک رہی تھی۔ آنحضرت ﷺ کے دور رسالت میں جو سازشیں ہوئیں ان سے لے کر کلسیائی جنگوں کی بربریت تک کو تفصیلاً دیکھا گیا ہے، اس بربریت کی بازگشت خلیج کی 1991ء والی جنگ میں بھی سنائی دیتی ہے۔

مصنف نے مغربی مستشرقین کے کردار پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ جنہوں نے اخلاص کا لبادہ اوڑھ کر اپنی تحریروں میں اسلام اور بانی اسلام ﷺ کے خلاف نفرت کے بیج بوئے ہیں۔ اسلام کے خلاف عداوت کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ دشمنی کی اس آگ کو بعض مسلمانوں نے خود بھڑکایا ہے۔ مغرب کی مادی ترقی سے چکا چوند ہو کر بعض مسلمان دانشوروں نے اسلام کے اس مسخ شدہ رُخ کے سامنے گھٹنے ٹیکنے شروع کر دئے، اس لئے وہ بھی اس نفرت کے ذمہ دار ہیں۔ سلمان رشدی ادب کی اس صنف کا نتیجہ ہے جس کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ اس کی تمام تحریروں کا احاطہ کیا جائے۔ اس کے بارہ میں یہ چیز خاص نوٹ کی گئی ہے کہ اس پر سیکس (جنس) کا خبط اس قدر سوار ہے کہ جو اسے فحش بازاری زبان میں لکھنے پر مجبور کرتا ہے۔ ایسی فحش عبارتیں اس کی تحریروں کا امتیازی وصف ہیں بشمول بچوں کیلئے لکھی گئی کتابوں کے۔

رشدی میں یہ چیز بھی قابل ذکر ہے کہ وہ غرور اور خود فریبی میں مبتلا ہے جس کی وجہ سے وہ شہرت حاصل کرنے کیلئے کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ ایک لحاظ سے یہ شہرت کے ساتھ رنگ رلیاں منانے کے موقعہ کا امکان ہی تھا جس نے اسے ایسا قابل نزاع ناول لکھنے پر آمادہ کیا۔ آخر کار اس کے قلم سے نکلی ہوئی کتاب نے آنحضرت ﷺ اور تاریخ اسلام میں مذکور دیگر اسلامی

شخصیات کے کردار کو مسلنے کی ناپاک کوشش کی۔قتل میں ملوث لوگ ایسا اکیلے نہیں کرتے اور یہی وہ مقام ہے جہاں ارشد احمدی صاحب نے نا قابل تردید شہادت پیش کی ہے، یہ شہادت حالات پر مبنی ہونے کے باوجود اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ بعض دوسرے ادارے بھی اس میں ضرور شامل تھے۔مصنف کی دلیل یہ ہے کہ وہ شخص جو بذات خود یہ دعویٰ کر چکا ہو کہ اسے اسلام سے کوئی دلچسپی نہیں وہ اس کے باوجود ایسی ایذا رساں عبارتیں قابل احترام شخصیات کے بارہ میں لکھ جائے کہ ان سے ان کے متبعین کو زیادہ سے زیادہ گزند پہنچے۔پھر وہ پوچھتا ہے کہ قبل از اشاعت مصنف کو ایک خطیر رقم کیوں ادا کر دی گئی؟ مزید یہ کہ ناشرین کتاب نے قانونی مشیروں کے مشورہ کو رد کرتے ہوئے کتاب کی اشاعت کو روکنے سے کیوں انکار کیا؟ ان اور اس طرح کے دوسرے سوالوں کا جواب تو تبھی مل سکتا ہے اگر اس نتیجہ پر پہنچا جائے کہ رشدی کو اس مذموم مقصد کیلئے درپردہ تیار کیا گیا تھا اور شرارت کرنا ہی اسکا اصل مقصد تھا۔

ایسی گندی شرارت سے چند ایک کے اسلام کے خلاف جذبات تو شاید ٹھنڈے پڑ جائیں لیکن اس سے نسلی تعلقات کو استوار کرنے میں کوئی مدد نہیں ملتی۔اس کے اثرات برطانیہ میں بہت گہرے مرتب ہوئے ہیں۔مسلمان شہریوں اور مقامی باشندوں کے درمیان خلاء حائل ہو گیا ہے۔ 'حزب طاہر' اور 'تحریک خلافت' جیسے گروہوں کی جڑیں مضبوط ہو گئی ہیں۔ان کے ہتھکنڈوں نے اسلام کے خلاف شبہات کو تقویت بخشی ہے اور دونوں طبقوں میں عدم اعتماد پیدا ہو گیا ہے۔اس دائرہ اثر کو ختم ہو جانا چاہئے۔اہل مغرب کو چاہئے کہ اسلام کے بارہ میں کلیسائی جنگوں اور ایک زمانہ سے چلی آنے والی جھڑپوں کے نتیجہ میں مرتب ہونے والے نظریات کو ترک کر دیں۔چاہئے کہ وہ اس پالیسی کو خیر باد کہہ دیں کہ انہوں نے مسلمانوں کو بنیاد پرستی میں دھکیل کر ان کو بنیاد پرستی کی وجہ سے سزاوار بھی قرار دینا ہے۔

خیر ابھی فضاء افسردگی کے جذبات اور مکمل تباہی کے خیالات سے پوری طرح مکدر نہیں ہوئی۔کیونکہ اسلام کی مذمت میں آواز بلند کرنے والوں میں چند ایسے لوگ بھی مغرب میں موجود ہیں جو پرنس چارلس کی طرح غلطی کی نشاندہی کر کے باہمی مفاہمت کے لئے صدا بلند کر رہے ہیں۔ ارشد کی کتاب میں یہ قابل قدر کوشش کی گئی ہے کہ مسلمانوں کا جواب ان کے عقائد میں کمی بیشی کے

بغیر مفاہمت کے رنگ میں پیش کیا جائے۔ 'دی سٹینک ورسز ' کو اس کے سیاق وسباق میں پیش کر کے مسلمانوں کو ان کے مجروح جذبات سے عقلمندانہ اور ذمہ دارانہ طریق پر نپٹنے میں مدد دی گئی ہے۔ مذہبی معاملات میں ایک انچ بھی چھوڑے بغیر مفاہمت کا پل تعمیر کرنے کی یہ کتاب عمدہ کوشش کرتی ہے۔ یہ کتاب اس طرح سے مذہب اسلام کا اصلی چہرہ پیش کر کے اہل مغرب کے شبہات وتفکرات کو کم کرنے اور اس دین کے پیروکاروں کے خلاف عناد کی آگ کو کم کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ یہ کتاب ہر مکتب فکر کے لوگوں کے لئے مثبت مواد کی حامل ہے خواہ ان کا تعلق مشرق سے ہو یا مغرب سے، خواہ مسلم ہوں یا غیر مسلم۔ اس لحاظ سے زیر نظر کتاب قابل قدر ہے اور امید کی جاتی ہے کہ یہ پورے ذوق وشوق سے پڑھی جائے گی۔

ولید احمد

لندن 1996ء

دیباچہ

تقریباً تمام مغربی دنیا اس فتویٰ پر اشتعال میں آ گئی تھی جو کہ ایران کے سربراہ آیت اللہ خمینی نے سلمان رشدی کی کتاب ''شیطانی آیات'' شائع ہونے پر جاری کیا تھا۔ اس وقت تمام دنیا کے مسلمانوں کے دلی جذبات کی ہتک جو ہوئی اور ٹھیس پہنچی تھی اسے یکسر نظر انداز کرتے ہوئے یہ معاملہ آزادانہ رائے کے اظہار کی طرف موڑ دیا گیا۔

اور اسطرح بالخصوص مغربی میڈیا کو از سرنو عالمِ اسلام اور تمام مسلمانوں پر اعتراض کرنے کا موقع مل گیا۔ اسلام کے خلاف دلوں میں دبی ہوئی چنگاری پھر سے بھڑکنے لگی اور اس وجہ سے اسلام اور مغرب کے درمیان فاصلہ اور بھی بڑھ گیا۔

اس (رشدی افیئر) کے بھیانک قصّے کے معاً بعد بہت سے سوالات ہونے بھی تھے اور کئے بھی گئے۔ کون تھا یا کون تھے جنکے اوپر یہ الزام عائد کیا جا سکتا ہے جو تمام دنیا کو ایک امن کے جھنڈے تلے اکٹھا ہونے میں رکاوٹ پیدا کر رہے ہیں؟ کیا آپ کسی ایک انسان کو بے جا ''آزادی رائے کا حق'' دے کر کروڑ ہا ملکی باشندوں کے دلوں کو دکھ نہیں پہنچا رہے۔ ایک افسانہ کے پردہ میں کیا اس بات کی اجازت ہے کہ جان بوجھ کر شائستگی کی حد کو پار کیا جائے؟ کیا سلمان رشدی واقعی مسلمان تھا؟

وہ اسلام کے بارہ میں کیا علم رکھتا تھا۔ اور درحقیقت اسلام کے بارہ میں اس کے کیا احساسات ہیں، اور کس طرح گذشتہ سالوں میں یہ بدل گئے۔ کیا ''شیطانی آیات'' ایک مذہبی بحث ہے یا شروع سے ہی ایک سیاسی ٹائم بم تھا۔ خبردار کئے جانے کے بعد بھی کہ "The Stanic Verses" کتاب ایک سنگین صورت اختیار کر جائے گی کہ وہ اس کو سنبھال نہیں سکے گا، کیسے ممکن تھا کہ اکیلا رشدی ساری دنیا سے ٹکر لے سکے اور امید رکھے کہ وہ بچ نکلے گا۔ ان تمام نتائج سے بے نیاز ہو کر وہ کیا چیز تھی جس نے اس کو اپنے اشاعت کے اس فیصلے پر قائم رہنے دیا؟

''سلمان رشدی۔ بھوتوں کے آسیب میں'' کتاب ان تمام سوالات اور بہت سے متعلقہ سوالات کے جوابات ثقہ حوالہ جات کے ساتھ دیتی ہے۔ درحقیقت یہ کتاب ابتداء اسلام سے لے کر عہدِ حاضر تک مخالف اسلام سازشوں کو بھی بے نقاب کرتی ہے۔

باب اول

اسلام اور نبی پاک ﷺ پر ابتدائی حملے

اسلام پر حملے، جس طرح کہ دوسرے مذاہب کے ساتھ ہوتا آیا ہے، روز اول سے ہونا شروع ہو گئے تھے۔ جونہی نبی پاک ﷺ نے نبوت کا دعویٰ کیا تمام مکہ راتوں رات عملی طور پر آپ کے خلاف محاذ آرائی میں لگ گیا۔ اہل مکہ نے اپنے ناپاک بدعزائم کے ذریعہ اس نئے دین کو نیست و نابود کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، یعنی صرف ایک خدا کی عبادت کے تصور کو۔ سرور کائنات ﷺ کے متبعین کو سخت سے سخت سزائیں دی گئیں، ایسی کہ تاریخ انسانیت میں کسی قوم کے لوگوں کو ایسی ظالمانہ اذیتیں نہ دی گئی تھیں۔

اسلام پر ہونے والے حملے ابتداءً جسمانی نوعیت کے تھے۔ اسلام کے معاندین کا خیال تھا کہ رسول مقبول ﷺ کو قتل کر دینے سے یہ نیا مذہب پنپنے سے قبل ہی ختم ہو جائیگا۔ اور ایسا کرنے کے لئے معاندین اسلام تمام قسم کے حربے استعمال کرنے پر آمادہ تھے۔ لیکن سچے مذہب میں ایک پنہاں صفت لچک کی ہوتی ہے جس کو زور بازو سے چھینا نہیں جا سکتا۔ اسلام پر بھی یہی صورت حال صادق آتی ہے۔

طاقت کے استعمال کی یہ کوششیں اسلام کے خلاف رائیگاں گئیں۔ ہر گذرنے والے دن کے ساتھ اسلام بے نظیر کامیابیوں کے ساتھ پھیلتا چلا گیا۔ جیسا کہ تاریخ گواہ ہے جلد ہی سارے جزیرہ نما عرب نے اسلام بخوشی قبول کر لیا۔ آنحضور ﷺ کے وصال کے بعد بھی اسلام کے پھیلنے کی رفتار جوں کی توں بڑھتی رہی اور زیادہ وقت نہ گزرا کہ اسلام یورپ کے دروازے پر دستک دینے لگا۔

تقریباً یہی وہ وقت ہے جب اسلام پر حملوں نے علمی صورت اختیار کر لی، اس کے سرغنہ بعض عیسائی اور یہودی قلمکار تھے جنہوں نے اس امر کو اپنا پیدائشی حق اور مقصد حیات قرار دے دیا

کہ انہوں نے قرآن پاک اور احادیث میں نقائص اور تضاد تلاش کرنے ہیں۔ وہ اسلام کے خلاف حملوں کے لئے ہر قسم کے ذرائع کو استعمال کرنے لگے اور بدترین غلاظت اچھالنے کے لئے نبی پاک ﷺ کو ہدف بنالیا۔

شاید کچھ یہودی اور عیسائی ایسے بھی تھے جنہوں نے خود اپنے انبیاء کرام کی جد و جہد کو فراموش کر دیا تھا اور نادانستہ طور پر ایک مشترکہ دشمن یعنی اسلام کے خلاف متحد ہو گئے۔ اس منظر کا مختصر سا خاکہ حضرت مرزا غلام احمد مسیح موعود علیہ السلام نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

"عیسائی لوگ اسلام کے مٹا دینے کے لئے جھوٹ اور بناوٹ کی تمام باریک باتوں کو نہایت درجہ کی جانکاہی سے پیدا کر کے ہر ایک رہزنی کے موقع اور محل پر کام میں لا رہے ہیں اور بہکانے کے نئے نئے نسخے اور گمراہ کرنے کی جدید جدید صورتیں تراشی جاتی ہیں اور اس انسان کامل کی سخت توہین کر رہے ہیں جو تمام مقدسوں کا فخر اور تمام مقربوں کا سرتاج اور تمام بزرگ رسولوں کا سردار تھا۔ یہاں تک کہ ناٹک کے تماشاؤں میں نہایت شیطنت کے ساتھ اسلام اور ہادی پاک اسلام کی برے برے پیرائیوں میں تصویریں دکھلائی جاتی ہیں اور سوانگ نکالے جاتے ہیں اور ایسی افترائی تہمتیں تھیٹر کے ذریعہ سے پھیلائی جاتی ہیں جن میں اسلام اور نبی پاک کی عزت کو خاک میں ملا دینے کیلئے پوری حرامزدگی خرچ کی گئی ہے......

اسلام کی پاک تاثیروں کے روکنے کیلئے جس قدر پیچیدہ افترا اس عیسائی قوم میں استعمال کئے گئے اور پرمکر حیلے کام میں لائے گئے اور ان کے پھیلانے میں جان توڑ کر اور مال کو پانی کی طرح بہا کر کوششیں کی گئیں یہاں تک کہ نہایت شرمناک ذریعے بھی جن کی تصریح سے اس مضمون کو منزہ رکھنا بہتر ہے اسی راہ میں ختم کئے گئے "

(فتح اسلام صفحہ 5۔ روحانی خزائن، جلد نمبر 3)

عصر حاضر کے مغربی مستشرقین نے بھی گزشتہ صدیوں کے اپنے ہم منصبوں کے درپردہ عزائم کا اعتراف کیا ہے۔ میکسم روڈنسن (Maxim Rodinson) جو ایک فرانسیسی مستشرق ہے وہ اپنی کتاب 'محمد' میں مغربی قلمکاروں کے بدعزائم کا اعتراف کرتا ہے اگرچہ وہ خود کو اس زمرہ میں شامل نہیں کرتا۔ وہ کھلم کھلا قرآن پاک کے کلام الٰہی ہونے کے دعویٰ کی مذمت کرتا ہے اگرچہ

اس کے ساتھ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ مسلمانوں کے دین کو وہ عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ وہ لکھتا ہے "لیکن میں اس سے متفق نہیں اور میں بعد میں بھی اپنی رائے بدلنے والا نہیں جیسا کہ متعدد دیگر مستشرقین ایسا کر چکے ہیں یعنی مبہم محاوروں کے ذریعہ اصل مطلب کو چھپالوں"

(Rodinson, Mohammed, page 218)

ہانس کنگ (Hans Kung) جو ایک بے باک جرمن ماہر الٰہیات ہے وہ بھی عیسائیوں کے قرآن کریم کے مطالعہ کی اصل غرض بیان کرتا ہے۔ اس نے اس بات کا سراغ ازمنہ وسطیٰ کے زمانہ تک جالگایا ہے۔ وہ اپنی کتاب میں لکھتا ہے "جہاں تک لوتھر کا تعلق ہے وہ اس بات کے حق میں تھا کہ قرآن کا ترجمہ اور اس کی اشاعت ہونی چاہئے محض اس لئے تا ہر ایک کو معلوم ہو سکے کہ یہ کیسی ملعون، شرمناک اور مایوس کن کتاب ہے جو جھوٹ سے لبریز، من گھڑت باتوں اور خوفناک چیزوں پر مبنی ہے"

(Kung, Christianity and the World Religions, page 20)

مصنف نے تیر نشانہ سے کچھ زیادہ دور نہیں پھینکا۔ میرے خیال میں وہ یہ کہہ کر فراخدلی کا اظہار کر رہا ہے کہ آجکل کے سکالرز بڑے روادار ہیں۔ یہ بات عوام کے بارہ میں تو ٹھیک ہو سکتی ہے کیونکہ سکالروں کی رائے پہلے سے زیادہ پختہ ہے کہ وہ محمد صلعم کے دین سے محض نفرت کی بناء پر اسلام کی مسخ شدہ تصویر کو قائم و دائم رکھ سکیں۔ ایک زیادہ سوچا سمجھا فارمولا جو آجکل کے سکالروں پر چسپاں ہوتا ہے وہ کچھ یوں ہوگا: "جہالت سے چل کر گستاخیوں کے راستہ سے ہوتے ہوئے نفرت پر منتج"۔

اسلام پر حملوں کا موازنہ

اسلام پر ابتداء میں جو حملے ہوئے ان کا عصر حاضر میں ہونے والے حملوں سے موازنہ کیا جا سکتا ہے۔ حضرت نبی پاک ﷺ کے زمانہ میں خاص طور پر جنگی میدانوں میں مسلمانوں پر دشمن کا پلہ ہمیشہ بھاری ہوتا تھا۔ وہ عملی طور پر کمترین ہوتے تھے، وہ تعداد میں کم ہوتے تھے، ان کے پاس ہتھیار کم ہوتے تھے، ان کے پاس دشمن کی نسبت کم گھوڑے اور کم اونٹ ہوتے تھے، اور اکثر مسلمانوں کو جنگ کے داؤ پیچ کی کوئی تربیت نہ تھی، نہ ہی میدان جنگ کا تجربہ۔ اس کے برعکس

اہل مکہ تعداد میں بہت زیادہ تھے۔ بعض دفعہ ایک مسلمان کے مدمقابل تین مکہ والے ہوتے تھے۔ انہیں وافر تعداد میں سامان رسد، ہتھیار، گھوڑے اور اونٹ مہیا تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ سبھی مہارت یافتہ اور تجربہ کار سپاہی تھے۔ لیکن اس واضح فرق کے باوجود فتح وظفر مسلمانوں کو بار بار نصیب ہوئی کیونکہ وہ روحانی طور پر ایک ماوراء گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ نیز ان کا ایک خدا پر غیر متزلزل اور یقینی ایمان تھا۔ وہ اپنے عظیم راہنما کی مکمل اور تہ دل سے اطاعت کرتے تھے۔ مزید برآں ان میں جو با افراط صفات پائی جاتی تھیں ان کی بنیاد صدق اور اطاعت پر تھی۔ نیز مشکل وقت میں صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑتے تھے۔

اگر ہم پہلے دور کا آج کے دور سے مقابلہ کریں تو بڑی گہری مماثلت نظر آتی ہے۔ برتری کے تمام وسائل مغرب کی یہودی اور عیسائی اقوام کو میسر ہیں۔ انہیں ذرائع ابلاغ یعنی ٹیلی ویژن، ریڈیو، اخبارات پر مکمل کنٹرول حاصل ہے۔ اگرچہ یہ امر بظاہر نظر نہیں آتا تاہم ان تمام ذرائع کو اسلام اور اسلام کے مقاصد کے خلاف بلا روک ٹوک متواتر استعمال کیا جاتا ہے۔ ہر جہت سے کوئی موقعہ کھوئے بغیر حملے کئے جا رہے ہیں۔ یہ بلا شبہ پرانے دور کے اہل مکہ کی ہتھیاروں میں بالا دستی کے مترادف ہے۔

ان کی مادی طاقت کا انسان کو ہر وقت ہر جگہ احساس ہوتا ہے۔ اس کا مظاہرہ خلیج کی جنگ کے دوران نمایاں طور پر ہو گیا تھا جب وہ غنڈہ گردی کی دھمکیاں دینے لگے اور اتحادیوں کی مجموعی طاقت کو ایک مسلمان قوم کے مقابلہ پر لا کر کھڑا کر دیا۔ مغربی اقوام کے اتحادیوں کے عزائم لوگوں پر واضح تھے لیکن میں اس موضوع کی تفصیل میں یہاں جانا نہیں چاہتا۔ میں مغربی مستشرقین کے زہریلے قلم کا جواب دینا چاہتا ہوں اور ایسے لوگوں کی نقاب کشائی کروں گا جن کے سحر اور ہاتھ کی صفائی کو استعمال میں لا کر خطرناک خیالات اور شیطانی وساوس کو اکسانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان مستشرقین کے ساتھ بعض دوسرے فلسفی اور مبصرین (بشمول چند آزاد خیال اصلاح شدہ مسلمان) بھی ملے ہوئے ہیں جو ایسی کتابوں کے مطالعہ میں اس قدر کھو جاتے ہیں کہ وہ اپنے دینی عقائد کو پس پشت ڈالنا شروع کر دیتے ہیں۔ وہ الہامی صداقت کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ وجود اور ہستی باری تعالیٰ جیسے مسائل ان کے نزدیک سنجیدہ نہیں ہیں۔ ان میں سے کئی ایک تو مذہب کے

مخالف ہیں اور چونکہ وہ فطری خیالات کے ہوتے ہیں اس لئے وہ مذہب سے عناد پیدا کر لیتے ہیں۔

کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے والے نوجوان ، قبل اس کے کہ تعلیم مکمل کریں، وہ مذہب کے لئے اپنے فرائض کو فراموش کر کے مذہب کو ہی خیر باد کہہ دیتے ہیں۔ کچھ اسی قسم کے ماحول کا پروردہ شخص افق پر ابھرا اور مغرب کے ہاتھوں میں آلہ کار بن گیا۔ اور جب اس سے ان گنت دولت کا وعدہ کیا گیا تو وہ بھی مغرب کے جرم میں برضا ورغبت شریک کار بن گیا۔ یہ شخص سلمان رشدی تھا۔ یہ اس کی خوش قسمتی ہوتی اگر اس نے حضرت مرزا غلام احمد مسیح موعود و مہدی علیہ السلام کی ایک نظم میں کی گئی نصیحت کی طرف توجہ کی ہوتی

اے برادر دل منہ در دولت دنیائے دوں
زہر خوں ریزست در ہر قطرہ ایں انگبیں

(فتح اسلام صفحہ نمبر 45، روحانی خزائن جلد نمبر 3)

امر واقعہ تو یہ ہے کہ یہ سلمان رشدی کا ہی قلم تھا جس نے کتاب 'دی سیٹنک ورسز' The Satanic Verses لکھ کر مہلک ترین زہر اگلا۔ یہ سب کچھ کس طرح وقوع پذیر ہوا؟ وہ کس طرح انہوں نے کام پر تیار ہو گیا؟ اس کا ذہن اس طرف کیسے گیا جس کا کوئی سوچ بھی نہ سکتا تھا؟۔ کیا اس میں مالی منفعت سے بڑھ کر بھی کوئی عنصر شامل تھا؟ کیا اس واقعہ کا تعلق سیاست سے تھا یا کہ مذہب سے؟ کیا یہ مذکورہ امور کو ملا کر تیار کی گئی سازش تھی جو معاندین اسلام نے تیار کی تھی؟ کیا اس کو مکمل پیکیج بنا کر سلمان رشدی کو پیش کیا گیا تھا جس میں اس کو پیشگی معاوضہ رقوم (Royalties) دی گئیں جو مشروط تھیں؟۔ کیا پھر اسے حکم دیا گیا کہ جاؤ سر دھڑ کی بازی لگا دو اور جو بھی ذلیل ترین کام کر سکتے ہو کر دکھاؤ؟ اس نے ضرور اس بچے کی طرح محسوس کیا ہو گا جسے چاکلیٹ فیکٹری میں ہنگامہ آرائی کا پروانہ دے دیا گیا ہو۔ وہ اپنی لالچی آنکھوں پر بہ مشکل یقین کر سکا ہو گا۔ لیکن جیسا کہ حقائق سے ظاہر ہے وہ اس میں سے ایک جانور بن کر نکلا، جو غلاظت میں لت پت تھا۔ اور اس سے لالچ، منافقت، شنید، خدا کی شان میں گستاخی اور ارتداد کی بو آ رہی تھی۔

رشدی کے عقب میں سائے

رشدی کو اپنی کرتوتوں کے نتائج کا ضرور پہلے سے علم ہوگا۔ یہ ناممکن ہے کہ وہ اس قدر سادہ لوح تھا یا اس کے پس پشت میں جو طاقتیں کارفرما تھیں وہ اس قدر طاقتور تھیں کہ اس کی مجال نہ چل سکی یا وہ خود کو ان سے کنارہ کش نہ کرسکا۔ یا پھر اگر مافیا سٹائیل کا محاورہ مستعار لیا جائے تو یہ کہنا بجا ہوگا کہ اسے ایسی پیش کش کی گئی کہ وہ اسے ٹھکرا نہ سکا۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ یہ سلمان رشدی جیسے ایک فرد کا کام نہیں تھا۔ اگر اسلام کے بارہ میں اس کے محدود علم کو، اس کی غیر اسلامی پرورش کو، اس منصوبہ کی پشت پر مالی امداد کو اور نبی پاک سرور کائنات ﷺ اور اسلام پر جو علمی حملے ہوئے ان کو دیکھا جائے تو یہ تمام حقائق اس بات کی غمازی کررہے ہیں کہ یہ مذہب کے خلاف ایک زبردست سازش تھی جس سے مغربی طرز فکر اور اصول پرستی کو ٹھیس پہنچتی تھی۔

تمام حقائق اس امر کی نشاندہی کررہے ہیں کہ یہ یہودیوں اور عیسائیوں کے مابین سازش تھی جس میں انہوں نے کرایہ کے ٹٹو سے ساز باز کی جو آج کے زمانے میں فاؤسٹ (Faust) کہلانے کا حقدار ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ گٹھ جوڑ کا ازدواجی رشتہ جنت کی بجائے کسی اور مقام پر تیار کرکے عمل میں لایا گیا تھا۔

اسلام اور حضرت نبی پاک ﷺ پر از منہ وسطیٰ سے لے کر آج تک جو حملے ہوئے ہیں میں ان میں سے چند ایک کا جائزہ لوں گا اور دکھاؤں گا کہ ان میں کس قدر گہری مماثلتیں ہیں جو مبصرین اور مستشرقین کی علمی تصانیف میں پائی جاتی ہیں۔ اور یہ بھی عیاں ہوجائیگا کہ کسطرح محدود مکتب فکر اور حوالہ جات کو مغربی مصنفین نے صدیوں سے استعمال کیا ہے اور انہوں نے اسلام اور اس کے پاک پیغمبر ﷺ کی بلاثبوت کے مسخ شدہ تصویر پیش کی ہے۔ اور یہ بھی واضح ہوجائیگا کہ سلمان رشدی کی کتاب *The Satanic Verses* کی آخری شکل ان تمام حملوں کی اصل غرض ہے جو ماضی میں آنحضرت ﷺ پر ہوتے آئے ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ یہ کتاب انتقامی اور بدارادوں کے ساتھ فحش ترین لب ولہجہ میں لکھی گئی تھی۔

باب دوم

صلیبی جنگیں

سلمان رشدی کی رسوائے زمانہ کتاب دی سیٹنک ورسز (The Satanic Verses) کے پس پردہ جو مسموم کج فکری پائی جاتی ہے اس کا پتہ لگانے کے لئے ہمیں ماضی کی طرف رخ کرنا ہوگا۔ بالکل اس دور تک جب عہد وسطیٰ میں اسلام پر صلیبی جنگوں کے حملے ہو رہے تھے جس سے مسلمانوں اور عیسائیوں کے مابین پہلی مرتبہ حقیقی اور اصلی تصادم وقوع پذیر ہوا۔

مسلمانوں نے یورپ کے کئی ممالک پر قبضے کرنے شروع کر دئے تھے اور یہ کہنا بجا ہوگا کہ "اہل یورپ عرب کلچر، فلسفہ، سائنس اور میڈیسن کے علاوہ اسلام کی اقتصادی اور عسکری طاقت کی مدح سرائی کر رہے تھے" (Hans Kung, Christianity and the World Religions, p 20) کئی عیسائیوں نے بشمول ان کے حکمرانوں کے مسلمانوں کی رسوم کو اپنانا شروع کر دیا تھا۔ بلکہ کئی ایک تو مشرف بہ اسلام ہونا شروع ہو گئے تھے۔ مغربی مؤرخین نے اس دور کو مسلم کالونیلزم (توسیع نوآبادیات) کا نام دیا ہے۔ وہ جو مرضی کہہ لیں لیکن اس حقیقت سے فرار نہیں کہ یہ تاریخ کا ایک ایسا دور تھا جسے مغربی مؤرخین نے بھی مذہبی رواداری کا دور قرار دیا ہے۔ جس میں یہودیوں اور عیسائیوں کو حق حاصل تھا کہ وہ ایک محفوظ اقلیت بن جائیں اور امن وامان سے بلاخوف زندگی گزارتے ہوئے اپنے مذہب کی پیروی کرتے چلے جائیں۔ ہانس کنگ مسلمانوں کی اس رواداری کو تسلیم کرتا اور اس کا عیسائیت سے ان الفاظ میں موازنہ کرتا ہے:

"ازمنہ وسطیٰ کی اسلامی دنیا میں یہودی اور عیسائی اپنے مذہب کی زیادہ آزادی سے پیروی کر سکتے تھے بہ نسبت آجکل کے جابرانہ حکومتوں کے ممالک میں۔ ازمنہ وسطیٰ کے عیسائیوں میں اسکے بالمقابل فرق بہت نمایاں ہے۔ قتل عام نسبتاً شاذ ہی تھا اور مسلمان اس میں بالکل شریک کار نہ ہوتے تھے۔ قتل عام کو اخلاقاً نہ صرف معیوب سمجھا جاتا تھا بلکہ ایسا کرنا بھی خلاف قانون تھا۔ چونکہ

قانون خدائی قانون تھا اس لئے اسے گناہ کے زمرہ میں شمار کیا جاتا تھا"

(*Christianity and the World Religions*, p 104)

جیسا کہ تاریخ میں اپنے اپنے دور کی بڑی طاقتوں کے ساتھ ہوتا آیا ہے کہ کبھی وہ وقت بھی سر پر آن پڑتا ہے کہ ایوان حکومت لڑکھڑانے لگتا ہے اور رفتہ رفتہ لیکن یقینی طور پر ناممکن ممکن میں بدل جاتا ہے اور بڑی سلطنت کی طاقت ایک ہاتھ سے نکل کر دوسرے ہاتھ میں چلی جاتی ہے۔ مغرب میں گیارھویں صدی کے اواخر میں مسلمان عہد حکومت کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا جو خدائی منصوبہ کے عین مطابق تھا اور اس کی پیش خبری قرآن مجید میں دی جا چکی تھی۔ گیارھویں صدی میں اتحاد کا شیرازہ بکھرنے لگا، اور مسلمان عہد حکومت کے حصے بخرے ہونے لگ پڑے۔ شمال مغربی سپین کے شہزادوں کے ہاتھ موقعہ لگ گیا (جواب تک نیم آزاد تھے اور مسلمانوں کی مرکزی حکومت کو خراج ادا کرتے تھے) کہ وہ مکمل طور پر آزاد ہو جائیں اور ان علاقوں پر قبضہ کرلیں جو ان کے تابع تھے۔

رفتہ رفتہ اسلامی حکومت المرابطون کے ہاتھوں سے نکل کر بربر اقوام کے ہاتھوں اور وہاں سے المؤحد حکمرانوں کے ہاتھ میں آ گئی۔ المؤحد حکومت کے خاتمہ کے بعد عیسائی فاتحین نے بڑی تیزی سے ترقی کرنا شروع کردی۔ اگر چہ ہسپانوی مؤرخین میں بھی عربوں سے آزادی اور دوبارہ قبضہ (Reconquista) کے بارہ میں اختلاف پایا جاتا ہے لیکن اتنی بات ضرور واضح ہے کہ اس کا آغاز اس وجہ سے ہوا تا کہ اسلامی تہذیب اور طرز فکر کی لہروں کو تھام لیا جائے کیونکہ اس سیلاب میں عیسائیت نے بھی ڈوب جانا تھا۔ اسلامی تہذیب اس قدر ترقی یافتہ تھی کہ عیسائیوں کے پاس مسلمانوں کو سپین سے نکالنے کے حق میں کوئی دلیل باقی نہ رہی تھی۔ حتیٰ کہ 1602ء تک جب ویلنسیا (Valencia) کا لاٹ پادری جب بادشاہ فلپ سوم کو مسلمانوں کے ملک بدر کرنے کی وجوہات بیان کر رہا تھا تو اس نے یوں تبصرہ کیا: "وہ تو تمام مذہبی امور میں آزادی ضمیر کے حق میں ترانے گاتے ہیں۔ ترک قوم اور پیروکاران محمد (ﷺ) اس میں مبتلا ہیں اور وہ عوام کو اس سے لطف اندوز کرانا چاہتے ہیں۔"

ہائے بیچارے عیسائیوں کو آزادی سے عبادت کرنے پر مجبور کیا گیا، انہیں کھلم کھلا اپنی

رسومات منانے کی اجازت دی گئی تھی، اوران ستمگر مسلمانوں نے ان کے گرجا گھر تعمیر کرنے میں ان کا ہاتھ بٹایا۔ایک اورمؤرخ ہیو ٹریور روپر(Hugh Trevor-Roper) نے اپنی کتاب میں صلیبی جنگوں کے مشکوک عزائم پر تبصرہ کیا ہے جس کا یورپ کی توسیع کے پلان میں پورا حصہ تھا۔یروشلم میں مقدس مقامات کوآزاد کرانے سے اس کا ہرگز کوئی تعلق نہ تھا۔وہ کہتا ہے "ہسپانوی عیسائیوں کی سپین میں مسلمانوں پر پیش قدمی اور مشرقی یورپ میں جرمن نوآبادکاروں کے سلاوک قوم کے خلاف پیش قدمی، اور انگلستان کے اینگلو نارمن جاگیرداروں کا آئرلینڈ پر قبضہ، اورشمالی فرانس کے جاگیرداروں کالینگوئے ڈاک (Languedoc) پر قبضہ، اورخود بازنطینی سلطنت پر فرینک جاگیرداروں کی فتحیابی......کو دیکھ کر ہمیں باور کرنا پڑتا ہے خواہ ہم اسے پسند کریں یا نہ کریں کہ صلیبی جنگیں اس نوآبادیاتی توسیع کالازمی حصہ تھیں"۔

مغربی مؤرخین کی ایک عرصہ سے یہ رائے چلی آرہی ہے کہ صلیبی جنگیں غلامی میں جکڑے ہوئے اہل مغرب کا جن کا مسلمانوں نے استحصال کیا تھاان کے خلاف روحانی اور مادی جوابی حملہ تھا۔اوراس جدوجہد کومشرق اورمغرب یا اسلام اوردنیائے عیسائیت کے درمیان سنسنی خیز بنا کر پیش کیا گیا۔بعض نے توصلیبی جنگوں کی تحریک کومسلمانوں کے خلاف 'عیسائی جہاد' کا نام دیا ہے۔ تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہے کہ صلیبی عیسائیوں کا اصل اور حقیقی محرک مقدس مقامات کوآزاد کرانا اورعیسائیت کومنکروں کے پنجہ سے نجات دلانا تھا۔لیکن یہ بیان کردہ خیالات کیا تھے اوران کے حصول میں جوذرائع اختیار کئے گئے وہ دو بالکل مختلف چیزیں ہیں۔میں مغربی مصنفین کی کتابوں سے اقتباسات پیش کروں گا جنہوں نے صلیبی جنگوں کے دوران یورپی عیسائیوں کے غیرعیسائیانہ کردار کوتسلیم کیا ہے۔

اٹھارویں صدی کے مؤرخ ڈیوڈ ہیوم (David Hume) کے نزدیک "صلیبی جنگیں ایک آفاقی جنون اور جنگجوؤں کے غیرحقیقی اوررومانوی طیش کی وباء اورانسانی حماقت کا پائیدار کتبہ تھیں جوکسی بھی زمانہ یا قوم میں ظاہر ہوا ہو" (صفحہ 28)۔پھر لینارڈ ڈبلیو لیوی (Leonard W. Levy) پروفیسر آف ہیومینیٹیز،کلیئر مانٹ کالج امریکہ اپنی مقبول عام اور قابل نزاع کتاب خدا کے خلاف بغاوت (*Treason against God*) میں لکھتا ہے کہ صلیبی جنگوں کا دوراس

قدر بہیمانہ تھا کہ نا قابل تصور ہے۔" صلیبی جنگجوؤں نے ارض مقدس میں مسلمانوں اور یہودیوں کا قتل عام بلا تفریق کیا حتیٰ کہ عورتیں اور بچے بھی نہ بچ سکے" (صفحات 115۔116)۔

وہ جو ایک مقدس جنگ تھی آخر کار وسیع پیمانہ پر بربریت کی شکل اختیار کر گئی۔ اس دور کے اور اس کے بعد آنیوالی صدیوں میں ہونے والے عیسائی مؤرخین نے ان راہزن صلیبی جنگجوؤں کی لوٹ مار کی تصدیق کی ہے اور ان کے ہر بہیمانہ عمل کا جواز نکال کر عیسائیت کا تحفظ کرنے والوں کی تعریف اور شہادت کے رنگ میں تصویر کشی کی ہے۔ ایک برطانوی مؤرخ ٹریور روپر (Trevor Roper) نے اپنی کتاب میں ان میں سے چند ایک کا ذکر ایڈورڈ گبن (E. Gibbon) کے حوالہ سے کیا ہے۔ "سادہ لوح صلیبی جنگجو جنہوں نے اپنے اشتعال انگیز مگر مقدس اعمال کی تاریخ کے واقعات کو درج کرنے کا وقت نکال لیا۔ وہ جب ہر خونریز باب کا خاتمہ کرنے لگے تو کتاب مقدس سے حوالے نکالے اور اپنے عزائم پر سوچ بچار کی تو وہ سولہویں صدی کے ہسپانوی فاتحین (conquistodors) سے کچھ کم نہ تھے۔ ان کے نزدیک ترک قوم رسوا اور بد بخت منکرین میں سے تھی۔ وہ خدا اور ہم سب کے دشمن تھے، جبکہ عیسائی جو جنگوں میں مارے گئے تھے وہ جنت نصیب ہوئے جہاں وہ سفید چولہ زیب تن کئے ہوئے ہیں اور شہادت ان کی فتحیابی کی علامت ہے"۔

(*The Rise of Christian Europe*, page 101)

ٹریور روپر نے وضعدار فرقہ جیسوایٹ (Jesuit) سے منسلک لوئیس مائم برگ (Louis Maimbourg) کے چند ایک نظریات کا بھی ذکر کیا جو صلیبی جنگجوؤں کے اعمال کو حق بجانب گردانتا ہے۔ "اس کے نزدیک صلیبی جنگیں کچھ بھی ہوں مقدس جنگیں تھیں، جن کی بربریت کا جواز ان کے اعلیٰ روحانی مقاصد میں پنہاں تھا۔ پھر وہ مزے لے کر بیان کرتا ہے کہ کس طرح یروشلم کو فتح کرنے کے بعد عیسائیوں نے بحیثیت فاتح اپنی فتح کے حقوق سے فائدہ اٹھایا...... ہر جگہ بکھرے ہوئے قلم شدہ انسانی سر، کاٹی ہوئی ٹانگیں اور جسم سے الگ کئے گئے بازو، جسم ٹکڑوں میں چیرے ہوئے دکھائی دیتے تھے...... انہوں نے ماؤں کی گودوں میں موجود بچوں کو قتل کر کے ان کا نشان مٹا دیا، تا اس بد بخت قوم کے ساتھ وہی کچھ ہو گذرے جو خدا نے اس سے قبل عملیکا ئیٹس

(Amalekites) قوم کے لئے مقدر کیا تھا۔"
(*The Rise of Christian Europe*, pp 101/102)

سرسٹیون رنسی مان (Sir Steven Runciman) نے صلیبی جنگوں اورعصر حاضر کا عیسائی متوازن نقطہ نظر اپنی تین جلدوں پر مشتمل کتاب کے آخر پر پیش کیا ہے۔ اگر چہ اس نے نرم زبان اورلب ولہجہ اختیار کیا ہے لیکن پھر بھی صلیبی جنگوں کے ظلم وستم اور بہیمت کا اندازہ آسانی سے ہو جا تا ہے۔ "صلیبی جنگوں کی فتح دراصل مذہب کی فتح تھی۔ لیکن مذہب بغیر دانشمندی کے خطرناک چیز ہے صلیبی جنگیں المنا کی اور بربادی کی داستان تھی۔ جب ایک مؤرخ صدیوں پرانے واقعات پر نظر ڈالتا ہے تو ان بہادری کی کہانیوں کے سامنے اس کا جذبہ تعریف غم کے نیچے چھپ جا تا ہے اوراس سے انسانی فطرت کی خامیوں کی نشاندہی ہونے لگتی ہے۔ بہادری کی فراوانی کے ساتھ ساتھ بلند مقاصد، ظلم اور لالچ، مہم جوئی اور ثابت قدمی کے ساتھ اندھی اور تنگ نظر خودراستی نے کلنک کا ٹیکہ لگا دیا ہے۔ جنگ مقدس اس سے زیادہ کچھ نہ تھی کہ خدا کے نام پر غیر رواداری کا لمبا عمل ثابت ہوئی جوروح القدس کے خلاف گناہ ہے"
(*A History of the Crusades*, Harmondswoth, Penguin, 1965, p 480)

صلیبی جنگیں، نوآبادیات اورسامراجیت

جب مغرب کی عیسائی اقوام مسلمانوں کا یورپ سے اخراج کر چکیں تو انیسویں صدی کے دوران برطانیہ اور فرانس نے مسلمان ممالک پر حملے کرنے شروع کر دئے۔ مثلاً فرانس نے 1830ء میں الجیریا کو اپنی کالونی بنالیا، اور برطانیہ نے عدن کو 1839ء میں کالونی بنالیا۔ باہمی طور پر دونوں ممالک نے تیونس (1881ء)، مصر (1882ء)، سوڈان (1898ء)، لیبیا اور مراکش (1912ء) پر قبضہ کرلیا۔ اگر چہ 1920ء میں انہوں نے عرب اقوام سے وعدہ کیا تھا کہ سلطنت عثمانیہ کی پسپائی کے بعد ان کو آزادی دے دی جائیگی لیکن پھر بھی برطانیہ اور فرانس نے شرق اوسط کو زیر انتظام ریاست اور زیر نگرانی ریاست میں تقسیم کر کے قبضہ جمائے رکھا۔ صلیبی جنگوں، یوروپین نوآبادیاتی نظام اور عیسائی مشنری کام میں گٹھ جوڑ پر کافی بحث وتکرار ہو چکی ہے، اہل مغرب نے اس نظریہ کو تسلیم کرنے میں انقباض ظاہر کیا ہے لیکن بعض مستشرقین اور مغربی

مصنفین نے دیانت داری سے کام لیتے ہوئے اس نقطہ نظر سے اتفاق کیا ہے۔مثلاً منٹگمری واٹ اپنی کتاب میں لکھتا ہے:" تاریخ کی سدھ بدھ رکھنے والے عیسائی آج صلیبی جنگوں پر نازاں ہیں اور شاید یہ کہنے میں دریغ نہیں کرتے کہ ان میں کالونیلزم کا عنصر شامل تھا۔"
(Watt, *Muslim-Christian Encounters*, page 82)
کیرن آرام سٹرانگ (Karen Armstrong) جو ایک برطانوی مصنفہ، براڈ کاسٹر اور سابقہ رومن کیتھولک راہبہ ہے۔وہ دوسروں سے زیادہ دیانت دار ہے۔اس نے مسلمانوں کے نقطہ نظر سے اتفاق کرتے ہوئے اپنی کتاب *Muhammad, A Western Attempt to Understand Islam* میں لکھا ہے:" آج کے دور میں اسلامی دنیا مغربی سامراجیت اور عیسائی تبلیغ کا صلیبی جنگوں سے رابطہ نکالتی ہے، اور وہ ایسا کرنے میں غلط ڈگر پر نہیں ہیں۔جب 1917ء میں جنرل ایلن بی (General Allenby) یروشلم میں داخل ہوا تو اس نے صلیبی جنگوں کی تکمیل کا اعلان کیا۔ جب فرانسیسی دمشق میں داخل ہوئے تو ان کا کمانڈر سلطان صلاح الدین ایوبی کے مزار واقع جامع مسجد پر کھڑے ہو کر چلایا " اے صلاح الدین ہم لوٹ آئے "۔عیسائی مشنری کام نو آبادیات بنانے والوں کی پشت پناہ پر تھا تا کہ مسلمانوں کی روایتی تہذیب کو مفتوحہ ممالک میں کم تر کر دے۔نو آبادیات بنانے والوں کی منطق کچھ اس طرح تھی کہ وہ انہیں ترقی اور روشن خیالی کی ڈگر پر ڈال رہے ہیں لیکن ان کو اس کوشش کا جواب تشدد اور حقارت کی صورت میں ملا۔"
(K. Armstrong, *Muhammad*, page 40)
یہ ظلم وستم اور بہیمانہ سلوک انیسویں صدی اور بیسویں صدی پر حاوی رہا۔الجیریا میں امن لانے میں کئی سال بیت گئے اور جب بھی الجیریا کے عوام نے مزاحمت کی تو اسے جوابی وحشیانہ حملوں کے ذریعہ کچل دیا گیا۔عصر حاضر کا فرانسیسی مؤرخ ایم باڈری کورٹ (M. Baudricourt) ان جوابی حملوں کی جھلک یوں پیش کرتا ہے:" ہمارے سپاہی جو حملے سے واپس آرہے تھے وہ شرمسار تھے ......قریب اٹھارہ ہزار درخت خاکستر کر دئے گئے، عورتیں، بچے اور ضعیف العمر افراد موت کے گھاٹ اتار دئے گئے۔بعض بدقسمت خواتین جن کو کان میں بالیاں، بازو پر، یا ٹانگ میں چاندی کے چھلے پہننے کی عادت تھی، ان کو دیکھ کر حرص کی دیوی بیدار ہو جاتی تھی۔ان چھلوں کا

فرانسیسی چھلوں سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ چھلے نوجوان لڑکیوں کے اعضاء کے ساتھ یوں جوڑ دئے جاتے ہیں کہ ان کو الگ نہیں کیا جا سکتا چاہے وہ عمر میں بڑی بھی ہو جائیں۔ انہیں اتارنے کے لئے سپاہی ان کے اعضاء کاٹ دیتے اور ان کو اس زخمی حالت میں زندہ چھوڑ دیا جاتا تھا۔"
(Maudricourt, *La Guerre et le Gouvernement de l'Algiere*, Paris, 1853, page 160)

اسلامی موازنہ

اس کے برخلاف مسلمانوں کی فتوحات کس قدر مختلف تھیں۔ جب مسلمانوں نے کسی جنگ میں فتح حاصل کی تو کسی بھی جگہ پر بھی ایسی خون ریزی، ایسی بہیمیت اور ظلم وستم کی مثال نظر نہیں آتی۔ جنگی قیدیوں سے انسانی سلوک کے بارہ میں قرآن حکیم کی تعلیمات کس قدر مختلف تھیں، ایسی تعلیمات جو فاتح کو مفتوح سے اچھا سلوک سکھلاتی ہیں۔ اس ہمدردانہ تعلیم کے عملی نمونہ کی مثال آنحضور ﷺ کے نمونہ سے کہیں بہتر نہیں ہوسکتی۔ مسلمان فاتحین کا حضرت محمد ﷺ کی سرکردگی میں مکہ میں داخل ہونا، رحمدلی اور درگذر کا ایسا واقعہ ہے جس کی مثال تاریخ میں ملنا ناممکن ہے۔ حضرت نبی پاک ﷺ اور ان کے پاک صحابہ کرام کے خیالات ضرور اہل مکہ کے ہاتھوں سالہا سال تک ملنے والے ایذا رسانی کی طرف گئے ہوں گے۔ ان کو انسانیت کی حدود سے باہر جا کر دکھ اور تکلیف پہنچائی گئی انہوں نے اپنے اہل بیت اور احباء کو ذبح ہوتے دیکھا۔ اور قتل عام سے دریغ نہ کیا گیا محض اس لئے کہ وہ خدائے واحد پر ایمان رکھتے تھے۔

اور جب وہ فتحیاب ہو چکے اور دشمن واقعتاً ان کے قدموں پر پڑا ہوا تھا، تو ان سے کس ردعمل کی توقع ہوسکتی تھی؟ محمد ظفر اللہ خاں جو ایک معروف مذاہب عالم کے احمدی سکالر تھے وہ اپنی کتاب Muhammad, Seal of the Prophets میں اس کا منظر یوں پیش کرتے ہیں:

"حضرت محمد ﷺ نے قریش کے لیڈروں کو بلایا اور ان سے سوال کیا کہ ان کے ساتھ کس طرح کا سلوک کیا جانا چاہئے۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ آپ ﷺ ان کو جیسی بھی سزا کا حقدار سمجھیں وہی مناسب ہے۔ لیکن انہیں اس بات کا علم تھا کہ آپ ﷺ ان کی برادری سے ہیں اور فراخدل بھی ہیں اور اسی کی بناء پر سلوک فرمائیں گے۔ اور اس پر آپ حضور ﷺ نے سزا کا اعلان حضرت

یوسف علیہ السلام کے الفاظ میں کیا جو انہوں نے اپنے بھائیوں سے مخاطب ہو کر کہے تھے کہ آج تم سے کوئی بدلہ نہیں لیا جائیگا۔(سورۃ یوسف39:12) آپ ﷺ نے انہیں فرمایا کہ تم آزاد ہو، اہل مکہ کی آپؐ کے لئے حقارت اور تضحیک، ان کا لامحدود عناد اور نفرت، ان کی سالہا سال پر محیط بلاتعطل سنگین اور ظالمانہ ایذا رسانی، تمام لڑائی جھگڑے، تمام مشکلات اور مصائب، آپؐ کے پیارے اور جانثار صحابہ کا جانی نقصان۔ تمام کے تمام اس فتح کے لمحہ میں ایک طرف الگ رکھ دیئے گئے اور ان کی یاد ذہنوں سے اوجھل ہوگئی اور خدا تعالیٰ کے نام پر جو بے حد رحمان اور رحیم ہے، جو خالق ہے اور ہر کسی کا آقا ہے......محبت اور رحم کے دروازے کھول دیئے گئے، صبح کے وقت جو جانی دشمن تھے وہ دوپہر تک گہرے دوست بن گئے، بعض دل ابھی بھی پژمردہ تھے، بے عزتی جو رحمدلی کے آگے نرم پڑ چکی تھی اس کو برداشت کرنا مشکل تھا لیکن پیغمبر خدا ﷺ نے جس رحمدلی اور فراخدلی سے مرہم لگائی تھی اس کے صحت بخش اثرات کے سامنے وہ زیادہ دیر باقی نہ رہ سکی۔ جس وسیع پیمانے پر آپؐ نے بے مثال درگذر اور ہر جہت سے پوری رحمدلی کا سلوک کیا تاریخ اس جیسی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ "

(Zafrullah Khan, *Muhammad - Seal of the Prophets*, pp 235-236)

اس رحمدلی اور درگذر کی مثال کو خلفائے اسلام اور دوسرے مسلمان لیڈروں نے بھی آنحضور ﷺ کے بعد جاری رکھا۔ مثلاً مشہور صلاح الدین جس کی تعریف و توصیف میں مغربی مؤرخین بھی رطب اللسان ہیں۔ عظیم فرانسیسی ادیب وولٹیئر (Voltaire) نے صلاح الدین کو اپنا ہیرو تسلیم کیا تھا۔: "وہی صلاح الدین جو صلیبی جنگجوؤں کا عظیم ترین دشمن تھا۔ جب وہ عیسائیوں کو میدان جنگ میں شکست فاش دے چکا تو مرتے دم اس نے وصیت کی کہ اس کا متروکہ مسلمان، یہودی، اور عیسائی غرباء میں غیر جانبداری کیساتھ تقسیم کردیا جائے۔"

(Voltaire, *The Rise of Christian Europe*, page 104)

رومانوی ناول نویس سر والٹر سکاٹ (Sir Walter Scott) بھی سلطان صلاح الدین کی خوبیوں کے گن گاتا ہے۔ وہ اس کو یورپ کے شریف النفس حکمرانوں سے وابستہ کرتا ہے۔ وہ بہ یک وقت اپنے ہیرو رچرڈ دی لائن ہارٹ (Richard, the LionHeart) کے ظلم وستم اور تشدد سے بھی خوب آگاہ تھا۔ اس نے جو صلیبی جنگوں کی روئیداد لکھی وہ اس کی کہانی

'The Talisman' کے دیباچہ میں لکھتا ہے: "وہ دور جس کا تعلق صلیبی جنگوں سے ہے......وہ ایک ایسا دور تھا جس میں رچرڈ اول کے جارحیت کا کردار بہت عجیب ہے۔ جنگلی مگر رحمدل، بہادری کا اعلیٰ نمونہ، خوبیوں کا اچنبھہ، اور پھر اس کی نا معقول غلطیاں، یہ صلاح الدین سے متضاد تھیں۔ اس کے کردار میں عیسائی اور انگریز بادشاہوں کا ظلم واستبداد، دنگہ فساد رچا بسا ہوا تھا (جس سے کسی مشرقی حکمران کو تعلق ہونا چاہئے تھا) اس کے برعکس صلاح الدین نے نہایت درجہ پارسائی اور دانشمندی کا مظاہرہ کیا جو کہ کسی مغربی حکمران کی حکمتِ عملی اور مصلحت اندیشی ہونا چاہئے تھی۔"

(Walter Scott, *Muslim-Christian Encounters*, pp 79-80)

اسی طرح کا تقابلی کردار ہمیں سپین میں نظر آتا ہے جو اسلام کی آمد کے بعد جلتی دوزخ سے نجات پا کر بہشت ارضی بن گیا۔ اس کا خلاصہ مصنف سٹینلی لینپول (Stanley Lanepool) نے اپنے الفاظ میں یوں پیش کیا ہے: "اندلس پر کبھی بھی اس قدر رحمدلانہ، منصفانہ، اور دانشوارانہ حکومت کسی نے نہ کی تھی جیسی کی عرب فاتحین نے کی۔ بالعموم عوام صابر وشاکر تھے بس اتنے ہی صابر و مطمئن جتنے کہ وہ لوگ جن کے حکمران ایک مختلف نسل اور عقیدہ والے تھے۔ اور وہ اس سے حد درجہ بڑھ کر خوش جس قدر کہ وہ اس وقت تھے جب ان کے حکمران ان کے اپنے ہم مذہب لوگ تھے جس پر ان کا اعتقاد واجبی سا تھا۔

(*The Moors in Spain*)

"مسلمانوں نے اپنی مفتوحہ اقوام کو خواہ وہ کسی مذہب سے ہی تعلق رکھتے ہوں، اپنے مذہب کی پیروی کی کھلی آزادی دے رکھی تھی"۔ (Albert & E. Vail, *Transforming Light*)

مسلمانوں نے جس طرح مختلف مذاہب وملت والوں پر حکومت کی اس کی وضاحت سٹینلی لینپول کے درج ذیل اقتباس میں کی گئی ہے۔: "محکوم لوگوں کو اپنے قوانین اور جج رکھنے کی اجازت تھی......انہیں وہ حقوق حاصل تھے جن کی گوتھک (Gothic) بادشاہوں نے کبھی اجازت نہ دی تھی۔ وہ اپنی زمینیں بیع کر سکتے تھے۔ مذہبی رواداری میں انہیں کوئی خسارہ نہیں تھا۔ بجائے ان پر جبر کرنے کے یا زبردستی ان کا عقیدہ بدلنے کے جس طرح گوتھک بادشاہوں نے یہودیوں سے کیا تھا، اس کے برخلاف عربوں نے انہیں مذہب تبدیل کرنے پر مجبور نہ کیا۔ انہیں مکمل آزادی تھی کہ وہ جس کی چاہیں عبادت کریں......عیسائیوں کی اپنے نئے حکمرانوں سے تشفی کا بہترین ثبوت

اس حقیقت سے ملتا ہے کہ آٹھویں صدی میں ایک دفعہ بھی مذہبی بغاوت نہ ہوئی۔"

روڈنی کیسلڈن (Rodney Castleden) نے اپنی کتاب *World History (Paragon 1994)* میں یہودیوں کو جو مصیبتیں دوسری قوموں کے ہاتھوں پہنچیں ان کا ذکر بار بار کیا ہے۔ لیکن مسلمانوں کے ہاتھوں بڑے پیمانے پر ایذارسانی کا ایک بھی حوالہ نہیں دیا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ مسلمانوں نے ہمیشہ ہی اعلیٰ خوبیوں کے نمونہ کا مظاہرہ کیا۔ لیکن عیسائی مصنفین کی اکثریت نے ان سے انصاف کا سلوک نہیں کیا کہ وہ اپنے مدمقابل کے اوصاف بیان کر سکیں۔ انہوں نے عیسائیوں کو اسلام کے نظام عقائد سے محفوظ رکھنے کے لئے جو ہتھکنڈے استعمال کئے ان میں سے ایک یہ تھا کہ اپنے مدمخالف پر کسی بھی صورت میں بہتان تراشی کی جائے۔

باب سوم

اسلام کے خلاف نفرت

یہ بات واضح ہے کہ اہل مغرب صلیبی جنگوں کے ظلم وتشدد اور بے شرمی سے خوب آشنا ہیں۔ بے شمار مصنفین اور مؤرخین قبیح واقعات بیان کر کے ان کی مذمت کر چکے ہیں اس لئے ہم نے سوچا کہ انہوں نے اس سے کوئی تو سبق سیکھا ہوگا۔لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔طرفہ تماشا یہ کہ باوجودیکہ وہ ان رسوا شدہ تاریخی شواہد سے داغدار ہو چکے ہیں لیکن آج پھر حکمران عیسائی اقوام اسی نوع کے وحشیانہ اور بہیمانہ طرز عمل کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔مثلاً 1992ء کی خلیج کی جنگ میں ان سب نے گٹھ جوڑ کر کے ایک قوم پر ہلہ بول دیا۔چند ہفتوں میں ہی اتحادیوں نے عراق کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔فضاء میں سے ہوائی بمباری کر کے جو بھی سامنے آیا بلاتفریق ہلاک کر دیا گیا،جن میں معصوم عوام،عورتیں اور بچے شامل تھے۔ یہ سب کچھ نام نہاد انصاف کے نام پر روا رکھا گیا۔آج کے دور کے صلیبی جنگجوؤں نے اپنے وحشیانہ اقدام پر غلاف چڑھا کر جواز نکال لئے اور اپنی جارحیت کو اچھائی اور شرافت کا نام دے کر اصلیت کو چھپا لیا۔

خلیج کی جنگ شروع میں چونکہ دو مسلمان ممالک کے درمیان تھی اس لئے عیسائی اقوام کو اس بات کا فکر نہ تھا کہ وہ کس کا ساتھ دیں جب تک کم از کم ان میں سے ایک قوم کا مکمل طور پر تباہ ہونا قطعی تھا۔ آج بھی اسلام کے خلاف نفرت کچھ اسی نوعیت کی ہے۔ بوسنیا کی جنگ میں بھی اہل مغرب نے مسلمانوں کے ساتھ زیادتی پر تشویش کا اظہار کیا،اگر اہل مغرب فی الواقعہ اس جنگ کو ختم کرنے کے خواہاں ہوتے تو وہ بوسنین مسلمانوں کے خلاف ظلم وتشدد اور بغض وعناد کو چند ہی ہفتوں میں ختم کر سکتے تھے جس طرح انہوں نے اتحادیوں کی مجموعی طاقت کو بروئے کار لا کر خلیج کی جنگ کو ختم کیا تھا۔لیکن بوسنیا کی جنگ مزید چار سال تک جاری رہی اور صورت حال بجائے سدھرنے کے رفتہ رفتہ دگرگوں ہوتی گئی۔ یہ تو اہل مغرب کی دورخی تنگ نظری کی ایک اعلیٰ درجے کی

مثال ہے۔اوراس سے اقوام متحدہ ایک بار پھر غیر مؤثر اور بے کار ادارہ ثابت ہوئی۔

اہل مغرب کی اسلام کے خلاف نفرت بہت قابل فہم اور بڑی آسانی سے سمجھ آسکتی ہے۔ مشکل یہ ہے کہ دنیا اس کا نوٹس نہیں لینا چاہتی اور یہ دوزخ ان کے عین سامنے ہے جس کو وہ نظر انداز کر دیتے ہیں۔کسی نامعلوم وجہ سے مغرب کی عیسائی اقوام اسلام کے خون کو خونخوار چمگاڈر کی طرح چوسنا چاہتی ہیں۔انہیں اسلام کے علاوہ کسی اور دوسرے مذہب کا خون تشفی بخش نہیں لگتا ہے۔دوسرے مذاہب عالم جیسے ہندوازم اور بدھ ازم سے وہ ہرگز خوف زدہ نہیں ہوتے کیا یہ اس وجہ سے ہے کہ اسلام دور دراز علاقہ سے نہیں آیا یا اس میں غیر ملکی جادو نہیں جس کا تصور ان ہندوستانی مذاہب کے بارہ میں عوام الناس کے ذہنوں میں پایا جاتا ہے۔ایک جرمن مؤرخ پروفیسر جوزف وان ایس (Josef van Ess) نے اسلام سے نفرت کے موضوع پر اپنے مؤقف کا اظہار ہانس کنگ کی کتاب میں یوں کیا ہے:

"اسلام سے دلچسپی تو بہت پرانی ہے......ذرائع ابلاغ سے اسلام سے متعلق جو کچھ سننے یا پڑھنے میں آتا ہے اور جو صاحب دانش لوگوں کی بھی رائے ہے وہ بہت چونکا دینے والی ہے۔چونکا دینے والی دو رنگ میں، ایک یہ کہ یہ یک طرفہ آراء اور تعصب پر مبنی ہیں اور دوسرے یہ کہ جس قسم کے آسیب زدہ لب ولہجہ کو اختیار کیا جاتا ہے اس سے بدھ مت اور ہندومت سے بمقابلہ اسلام کوئی خوف نہیں کھاتا۔خوف تو ایک طبعی چیز ہے۔اس طرح کے ماحول میں گھسے پٹے نظریات کی فراوانی ہونے لگتی ہے اور مزید جاننے یا سمجھنے یعنی تجسس کی خواہش عمومیات اور جلد بازی کے ساتھ اخذ کئے ہوئے نتائج میں کھو کر رہ جاتی ہے...... اسلام کے خلاف من گھڑت محاورے لاشعور کی گہرائیوں میں پڑے ہوتے ہیں اور بلا اعتراض قبول کر لئے جاتے ہیں۔اس کی مثال اخبارات کے کارٹونوں میں مل جاتی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام ہمارے ثقافتی ورثہ کا حصہ نہیں ہے۔ اساتذہ اس موضوع کے لئے نہ کبھی تیار تھے اور نہ ہی اب تک تیار ہیں"

(Kung, *Christianity & the world religions*, pp 5-6)

ہانس کنگ اسی کتاب میں اس سے ملتے جلتے وسوسے کا اظہار کرتا ہے: "تاریخ کے دھارے پر اسلام اکثر دنیائے عیسائیت کے لئے ایک خلل انداز، دھمکی آمیز اور خوف میں مبتلا کر دینے والی حقیقت بن کر سامنے آیا ہے۔اور یہ حقیقت ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دو ہزار

سال بعد اور حضرت محمد (ﷺ) کے چودہ سو سال بعد اکثر عیسائیوں کے نزدیک اسلام ابھی تک ایک شر انگیز واقعہ سمجھا جاتا ہے حالانکہ یہ عیسائیت سے جغرافیائی طور پر نزدیک ہے اور دراصل اسکی وجہ بھی اس کی جغرافیائی نزدیکی ہے۔ عصر حاضر کی زندگی کی نبض پر انگلی رکھ کر حال ہی میں مشہور مصنفین نے اسلام کی نشاۃ ثانیہ کو مغرب کی تاریخ کے دھارے کو بدل دینے والا بدشگون واقعہ قرار دیا ہے۔ ہمیں اس حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہئے کہ اسلام ہمیں اجنبیت کا احساس دلاتا ہے اور سیاسی اور اقتصادی طور پر ہندومت یا بدھ مت سے زیادہ دھمکی آمیز لگتا ہے۔ بہر کیف یہ ایک ایسا امر ہے جسے ہمیں سمجھنے میں دشواری پیش آئی ہے۔" (صفحہ 19)

ایک ہماری ہمعصر برطانوی ادیب کیرن آرم سٹرانگ صدیوں پرانی زہریلی اینٹی سیمی ٹزم کے بعد یہودیوں اور عیسائیوں میں نئی مفاہمت پیدا ہو جانے پر اظہار خیال کرتے ہوئے سوال کرتی ہے کہ ان دو عظیم ادیان یعنی یہودیت اور عیسائیت کے سکالر یکدم پرانی عداوتوں کو برطرف کر کے صلح کرنے پر کیوں آمادہ ہو گئے ہیں۔ شاید انہوں نے اختلافات کو اس وجہ سے نظر انداز کیا ہے کہ 'سب سے بڑے دشمن' اسلام کی روندتی لہروں کی روک تھام کر کے مغرب کو زیروزبر ہونے سے بچا لیا جائے۔

جہاں تک تمام دنیا کی خیرسگالی کا تعلق ہے تو اسلام کو اجنبی مذہب سمجھا جاتا ہے۔ کیرن آرم سٹرانگ کی زود فہمی کی داد دیجئے کہ اس نے اس امر کا یہ کہہ کر اعتراف کیا ہے کہ "اسلام تمام اہم مذاہب میں سے واحد مذہب ہے جو دائرہ خیرسگالی سے خارج لگتا ہے اور کم از کم مغرب میں اپنا منفی تصور قائم رکھا ہوا ہے...... باوجودیکہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تیسرا مذہب ہے اور مغرب کی یہودی اور عیسائی روایات کے عین مطابق ہے۔ لیکن اسلام سے پرانی عداوت بحر الکاہل کے دونوں ساحلوں پر (یعنی یورپ اور امریکہ) روز افزوں ہے۔ اور لوگ اس مذہب پر حملے کرنے سے دریغ نہیں کرتے باوجودیکہ اس کے متعلق ان کا علم محدود ہے۔"

آرم سٹرانگ اس نفرت کی وجوہات کی وضاحت یوں کرتی ہے: "جارحیت تو قابل فہم ہے، کیونکہ ہماری صدی میں سوویٹ یونین کے عروج تک کسی طرز حکومت اور آئیڈیالوجی نے مغرب کو اسلام کی طرح مسلسل چیلنج نہ کیا تھا۔ جب ساتویں صدی میں اسلامی سلطنت معرض وجود میں آئی تو اس وقت یورپ ایک پسماندہ علاقہ تھا۔ مذہب اسلام نے کمال سرعت سے مشرق اوسط کی دنیائے

عیسائیت اور شمالی افریقہ کے عظیم چرچ کو زیرنگیں کرلیا۔ یہ درخشندہ کامیابی بہت خطرناک تھی۔ کیا خدا نے عیسائیوں سے منہ موڑ لیا تھا اور منکرین کو اپنی نظر کرم کا مورد بنالیا تھا۔؟ جب یورپ تاریکی کے دور (ڈارک ایجز) سے باہر نکل آیا اور اپنی عظیم تہذیب قائم کر چکا تو پھر بھی اسلام کی بڑھتی ہوئی اسلامی سلطنت کا خوف انہیں لاحق رہا۔ یورپ اس طاقتور اور اثر آفریں تہذیب پر اپنا کوئی خاص اثر نہ جما سکا...... اس خوف کیوجہ سے مغربی عیسائیوں کے لئے ناممکن ہو گیا کہ وہ مذہب اسلام کے بارہ میں منطقی اور حقیقت پسند رہ سکیں...... مغربی سکالروں نے اسلام کو خدا کی شان میں گستاخی کرنے والا مذہب کہا اور پیغمبر اسلام کو عظیم متنبّی کے طور پر پیش کر کے ان کی مذمت کی جس نے ایک اشتعال انگیز مذہب کی بنیاد رکھی تا وہ تلوار کے بل بوتے پر پوری دنیا کو فتح کر لے۔ اہل مغرب کے لئے محمد ایک خوفناک بھوت بن گیا جس کا ذکر مائیں نافرمان بچوں کو ڈرانے کیلئے کرتیں۔ یورپ نے اسلام کا یہ مسخ شدہ تصور قبول کر لیا۔ اور آج بھی اسلام کے بارہ میں ہمارے خیالات کو متأثر کرتا چلا آتا ہے۔ "

(Armstrong, *Muhammad, A Western attemp to Understand Islam*, pp 10,11)

مغربی مصنفین کی اکثر و بیشتر تحریریں جو سپرد قلم کی گئی ہیں، وہ رسول مقبول ﷺ اور دوسری برگزیدہ شخصیات کے بارہ میں ان کی قدر و قیمت کم کرنے والی اور ان کی آبرو اچھالنے والی ہیں۔ اسلام کے بارہ میں عوام الناس میں پائے جانیوالی غلط فہمیوں کی وجوہات میں سے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ اسلام کے بارہ میں غلط معلومات رکھتے ہیں۔ منٹگمری واٹ نے دیانتداری سے کام لیتے ہوئے اعتراف کیا ہے کہ اسلام کی خوبیوں اور خصائل کی اچھی طرح تشہیر نہیں کی گئی کہ جس سے اس کا مسخ شدہ پرتو بدلا جا سکے۔ " کئی عیسائی صلاح الدین کی شریف النفس سرداروں جیسی بردباری کا اعتراف کرنے لگے، لیکن اس موضوع پر بہت کم عالمانہ کام ہوا ہے۔ یہ فرانس اور مغربی یورپ کے سکالر ہی تھے جنہوں نے اسلام کا نیا اور تفصیلی تصور قائم کیا"

(Watt, M.C. *Encounters*, pp 80/81)

اسلام کا یہ نیا اور تفصیلی عکس درحقیقت ایسے پیچیدہ اور مسخ شدہ طریق سے پیش کیا گیا تا کہ اسلام کی تمام خوبیوں کی نفی ہو سکے۔ اب میں ازمنہ وسطیٰ کے دور سے شروع کر کے یورپ کے بعض ایسے ہی مصنفین کا جائزہ پیش کروں گا۔

باب چہارم

اسلام پر علمی اور ادبی حملے

یورپ میں عیسائی محققین کے اسلام پر قابل ذکر حملے قرون وسطیٰ میں خصوصاً بازنطینی علماء دین کی طرف سے آٹھویں صدی سے لیکر تیرھویں صدی کے دوران شروع ہوئے۔ ایسے حملوں کا جرمنی کی یونیورسٹی آف منسٹر (Munster) کے پروفیسر عادل تھیوڈور کھوری (Adel-Theodore Khoury) نے مطالعہ کیا ہے۔ کتاب کا نام *Polimeque Byzantine L'Islam*, Leiden, Brill, 1972, pp 359-365. ہے۔

اس قسم کی تصانیف میں اسلام کی تصویر ایک جھوٹے مذہب کے طور پر پیش کی گئی ہے، ایسا مذہب جس کا رجحان بت پرستی کی طرف تھا۔ محمد (ﷺ) کو نعوذ باللہ ایک مفتری نبی کے طور پر پیش کیا گیا جو شیطان کا چیلہ تھا جس کا محرک ابوالکذب تھا۔ اور وہ خود یقیناً عیسیٰؑ کا دشمن تھا۔ آپ (صلعم) کی مزعومہ اخلاقی کمزوریوں کو سامنے رکھ کر بات کا بتنگڑ بنایا گیا ہے۔ قرآن کو جھوٹی الہامی کتاب کہا گیا ہے جس میں محمد (صلعم) نے نہ صرف عہد نامہ عتیق اور جدید سے مواد نکال کر پیش کیا ہے، بلکہ اس میں ایسا مواد بھی شامل کیا گیا ہے جو منکرین جیسے مانے کینز (Manichaeans) کا وضع کردہ ہے، بلکہ اس میں من گھڑت مواد بھی شامل ہے۔ اس طرح اسلام کی تصویر کشی ایک ضرر رساں، شیطان کی وحی سے محرک شدہ مذہب کے طور پر کی گئی ہے جس کی تباہی عیسائی علمائے دین کی دلی تمنا تھی۔

اس ہتک اور افتراء پردازی کے کام کو آگے بڑھانے میں دوسرے عیسائی علما جیسے پیٹر دی ویزایبل (Peter the Venerable) ریکولڈو مانٹی کروچ (Ricoldo da Monte Croce) اور خاص طور پر ٹامس ایکوئے ناس (Thomas Acquinas) نے پوری سعی کی۔ انہوں نے ایسی کتابیں لکھیں جیسے *Disputations against the Saracens*

and the Quran جن کا موضوع سخن اسلام تھا، اگرچہ کچھ مواد ان میں صحیح اور ٹھوس تھا، مگر وہ اسلام کا غلط پرتو پیش کرنے میں کامیاب ہوگئے جو چار طرح کا تھا:

1 اسلام سراسر جھوٹ پر مبنی ہے اور صداقت کو دیدہ و دانستہ طور پر بگاڑا گیا ہے۔ محمد (صلعم) نے جھوٹ اور سچ کو خلط ملط کر دیا۔

2 اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو طاقت، تشدد، اور تلوار کے ذریعہ پھیلایا جاتا ہے۔

3 اسلام ایک مذہب ہے جو نفس پرستی کی تعلیم دیتا ہے۔ مسلمان کی روزمرہ کی زندگی کو سمجھنے میں جنسیت کا بہت بڑا پہلو ہے۔ یہ فرض کر لیا گیا کہ مسلمان بہت ساری بیویاں رکھ سکتا ہے، صرف چار ہی نہیں بلکہ سات یا دس یا پھر اس سے بھی زیادہ۔ یہ کہ بہشت میں اس کو دلربا حوریں ملنے کا وعدہ کیا گیا ہے۔ ایک ادیب نے تو یہاں تک گمان کر لیا کہ قرآن میں زنا کی اجازت دینے والی آیات پائی جاتی ہیں اور بعض دوسری آیات کے متعلق بھی تصور کر لیا گیا کہ وہ خلاف معمول جنسی حرکات کی اجازت دیتی ہیں یا پھر ایسے فعل پر اکساتی ہیں۔

4 محمد دجال (یعنی عیسیٰؑ کا دشمن) ہے۔ محمد کو جھوٹا نبی سمجھا گیا گویا کہ وہ حقیقت میں نبی نہیں تھا۔ اس نے عیسوی مذہب کی مخالفت میں نیا دین ایجاد کر لیا پس وہ ضرور کسی شیطانی فعل میں مصروف کار تھا، اور لازماً وہ شیطان کا آلہ کار یا کارندہ تھا۔ بہ الفاظ دیگر وہ دجال ہے۔

سرکار دو عالم ﷺ کے پاک کردار کو مزید ٹھیس پہنچانے اور بدنام کرنے کیلئے آپؐ پر اخلاقی کمزوریوں کا الزام عائد کیا گیا۔ جس کا مرکزی خیال یہ تھا کہ محمد (ﷺ) غیر سنجیدہ، شہوت پرست اور دھوکہ باز تھے۔ ٹامس کارلائل نے ان اعتراضات کو ایک سو سال قبل پوری شدت کے ساتھ استعمال کیا۔ اسلام کی اس مسخ شدہ تصویر کے اہم پہلو جن کی تشکیل عیسائی سکالرز نے بارھویں اور تیرھویں صدی کے دوران کی تھی وہ آج تک یورپین فکر ونظر کو کنٹرول کئے ہوئے ہے۔ مثلاً مشہور فرانسیسی مستشرق میکسم روڈنسن (Maxime Rodinson) اپنی کتاب Mohammed میں اس موضوع پر یوں اظہار خیال کرتا ہے: "علی الخصوص عیسائیوں نے اسے اپنا پکا دشمن بنا لیا، بول و براز کا ڈھیر، مرگی کے مریض کا فراڈ۔ اس کے مریدوں نے اس کی جو باتیں بیان کی تھیں ان کو توڑا مروڑا گیا تا اس کی ایک بدنما تصویر بنائی جا سکے جس سے وہ ایک ظالم،

نفس پرست فرد کی حیثیت سے دیکھا جائے جو ہر قسم کی بدی اور جرم میں لت پت ہے۔ "
(Rodinson, *Mohammmed*, pp 301/302)

کوئی صاحب عقل سلیم ایسی باتوں کو بمشکل ہی باور کرے گا۔

کالونیلزم اور عیسائیت

یورپین خصوصاً برطانوی، فرانسیسی اور ولندیزیوں نے تین سے چار سو سال کے عرصہ میں ایشیائی اور افریقن براعظموں پر پہلے تجارت کے ذریعہ پھر حددرجہ کے سیاسی دباؤ کے ذریعہ اور بالآخر اقتصادی نظام نو آبادیات کے ذریعہ اپنی طاقت کا تسلط جمائے رکھا۔ ان تغیر پذیر حالات میں اور عیسائی مشنریوں کی طرف سے تسلط جمانے کی کوششوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے جنہوں نے مقامی باشندوں پر عیسائیت ٹھونس دی۔

یورپین کالونیلزم مقامی عوام پر انتہائی ناگوار گزری۔ حکمراں طبقہ نے ان مقامی باشندوں پر اپنی فوقیت کا برملا اظہار کیا جسے تسلیم کرنے میں مغربی مصنفین کو کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی۔ اس کی مثال ہمیں اے جے بالفور (A.J. Balfour) اور لارڈ کرومر (Lord Cromer) کی تقاریر اور تصانیف میں مل جاتی ہے جن میں 1910ء کے لگ بھگ مصر پر برطانوی تسلط کے بارہ میں ذکر پایا جاتا ہے۔ انہوں نے برطانوی فوقیت کا ہونا بغیر سوال اٹھائے فرض کر لیا اور مشرق کی ہر قسم کی کمزوریوں کو ضرورت سے زیادہ رنگ میں بیان کیا جیسے خود حکمرانی کی گنجائش نہ رکھنا، معاشرتی اور اخلاقی گراوٹ، منطقی طور پر سوچ بچار کر سکنے کی عدم قابلیت ہونا وغیرہ۔

کالونیاں بنانے والوں نے یقیناً اپنے محکوموں سے کم ہمدردی کا سلوک کیا ان توقعات کے برعکس جو ایسے لوگوں سے ہو سکتی ہیں جن کا دھرم انسانی شرافت کی تکریم کا پرچار کرتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ یورپین مادی طور پر فوقیت رکھتے تھے اور باقی ماندہ دنیا ان کے اعلیٰ نظام تعلیم اور نظام حکومت سے نفع اٹھا رہی تھی لیکن اس چیز کا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ انہوں نے اس قسم کے تفوق کو اخلاقی تفوق سے الجھا دیا جس کے نتیجہ میں وہ اہل مشرق اور افریقہ کو اخلاقی لحاظ سے کمتر انسان سمجھنے لگے۔ ان کے نزدیک ایسے لوگوں کو عیسائیت کے ذریعہ حقیقی روشنی کی طرف رہنمائی کی اشد ضرورت تھی۔ بلکہ اس پر حد لگا دی تا کہ اس سے آگے کوئی سوچ ہی نہ سکے۔

وائیٹ کالونیلزم کے ناظمین اور جن مما لک کے عوام پر وہ حکومت کرتے تھے ان کے ما بین تعلقات کا دیا نتداری سے تجزیہ ٹامس مرٹن (Thomas Merton) نے ایک مضمون 'Cargo Cults of South Pacific' میں کیا ہے جو اسکی کتاب میں شامل اشاعت ہے۔ وہ کہتا ہے: "ہم اپنے سیاہ فام بھائی کی مدد کے لئے یقیناً تیار ہیں لیکن یہ مدد گستاخی، شیخی اور خوشدلی کے رنگ میں کی جاتی ہے۔ ہم اس کی مدد اس لئے کرتے ہیں تا وہ ہو بہو ہماری طرح کا ہو جائے جبکہ اس کے لئے ہماری طرح کا ہو جانا ناممکن ہے۔ اسطرح ہم اسے ایک پیچیدہ صورتحال میں ڈال دیتے ہیں اور پھر ہم حیران ہوتے ہیں کہ وہ کیونکر روحانی اذیت محسوس کرتا ہے۔ یقیناً یہ تو ہمارا بہانہ ہے کہ ہم ہر کسی کو اپنے راز میں حصہ دار بنانا چاہتے ہیں۔ جیسی دولت و امارت ہمارے حصہ میں آئی ہے ہم ہر کسی کو اس میں شریک بنانیکے خواہشمند نہیں ہیں۔ لیکن ہم جو کچھ کہتے ہیں اس کا اصل مطلب کچھ اور ہوتا ہے۔ ہم اپنے سے کم درجہ لوگوں کو اپنے مفاد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ ہم ان میں اپنا مفاد کچھ اس طور پر ودیعت کرتے ہیں کہ غیر ترقی یافتہ مما لک ہماری ماتحتی میں آج بھی مصروف عمل ہیں۔"

(Merton, *Love & Living,* Bantam Books, New York, 1980, p 77)

جہاں تک مادی طاقت کا تعلق ہے اہل مغرب کا یہ غرور جو پورے عروج کو پہنچ چکا تھا اس کے بارہ میں چودہ سو سال قبل قرآن مجید میں اللہ قادر مطلق نے سورۃ الکھف (18:35-36) میں قبل از قت اطلاع دے دی تھی۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے دو بڑی قوموں یعنی اہل نصاری اور مسلمانوں کی حالت کو تمثیلی رنگ میں پیش کیا ہے:

وَكَانَ لَهُ ثَمَرٌ ۚ فَقَالَ لِصَاحِبِهِ وَهُوَ يُحَاوِرُهُ أَنَا أَكْثَرُ مِنكَ مَا لاً وَّ أَعَزُّ نَفَراً ۔ وَدَخَلَ جَنَّتَهُ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ ۚ قَالَ مَآ أَظُنُّ أَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖٓ أَبَداً ۔

(ترجمہ) ''اور اس کے بہت پھل (والے باغ) تھے۔ پس اُس نے اپنے ساتھی سے جب کہ وہ اس سے گفتگو کر رہا تھا کہا کہ میں تجھ سے مال میں زیادہ اور جتھے میں قوی تر ہوں۔ اور وہ اپنے باغ میں اس حال میں داخل ہوا کہ وہ اپنے نفس پر ظلم کرنے والا تھا۔ اس نے کہا میں تو یہ خیال بھی نہیں کر سکتا کہ یہ کبھی برباد ہو جائیگا۔''

مندرجہ بالا آیاتِ کریمہ میں بتلایا گیا ہے کہ اپنی رنگ برنگی تاریخ میں عیسائی اقوام اپنی طاقت میں ایک بار پھر اعلیٰ مقام تک پہنچ جائینگی۔ اس کی ابتداء سترھویں صدی کی صبح طلوع ہونے سے ہوئی جب یورپ کی اقوام نے عظیم الشان ترقیات حاصل کرنا شروع کیں ۔ انہوں نے بے مثال طاقت اور شہرت حاصل کر لی جو انیسویں صدی میں اپنے عروج کو پہنچ گئی۔ اپنی مادی ترقی پر فخر کرتے ہوئے مغربی عیسائی اقوام کی زندگی آرام و آسائش اور عیش وعشرت والی ہوگئی اور اپنے غرور اور گستاخانہ رویہ کی وجہ سے انہیں غلط فہمی ہوگئی کہ ان کی طاقت، مادی ترقی اور بہبودیت ہمیشہ قائم و دائم رہے گی۔ وہ اپنے غلط احساس حفاظت اور اطمینان سے عارضی سکون حاصل کر کے مکمل طور پر گناہ اور بے انصافی کی زندگی میں روپوش ہو کر رہ جائیں گے۔ یہ سب کچھ عجب رنگ میں لفظ بہ لفظ صحیح ثابت ہو رہا ہے۔

برتر مغربی تہذیب

اب ہم کالونیوں کی رعایا کو محکوم بنانے کی طرف لوٹتے ہیں۔ محکوموں کے سامنے یہ لالچ رکھی جاتی رہی کہ وہ مفروضہ برتر مغربی تہذیب، نظام تعلیم اور عمومی طرز حیات کے پھلوں کا مزہ لے سکتے ہیں مگر اس کے ساتھ محکوموں کو اتنی دور رکھا جاتا کہ وہ مزید مزا حاصل کرنے کیلئے واپس ان کے پاس آتے رہیں۔ لیکن انہیں کبھی جی بھر کر مزہ لینے کی اجازت نہ دی جاتی تھی۔

مغربی طرز کی جو تعلیم مہیا کی جاتی تھی اسے اکثر مقامی لوگ پسند کرتے تھے، جن میں بہت سارے مسلمان بھی شامل تھے۔ لیکن عیسائیت قبول کرنے کا دباؤ ہمیشہ موجود ہوتا تھا۔ حتیٰ کہ میڈیسن کے میدان میں ہسپتال اور میڈیکل کلینک قائم کر دئے جاتے، وہاں سے بعض جگہوں سے رپورٹ ملی ہیں کہ علاج کی شرط یہ تھی کہ مریض ان کی عبادت میں شامل ہوں گے یا پھر وعظ کو ہی سنیں گے۔

ہندوستان میں ہندوؤں اور افریقہ میں قدیم دور کے لوگوں کی ایک بھاری تعداد کو مادی ضروریات سے مجبور ہو کر عیسائیت کو قبول کرنا پڑا۔ تاہم مسلمانوں میں سے مذہب تبدیل کرنے والوں کی تعداد بہت کم تھی شاید اس لئے کہ عین اس وقت مغربی علماء دین نے اسلام کی مسخ شدہ

تصویر پیش کرنے کی روایت کو جاری رکھتے ہوئے کثیر تعداد میں کتابیں شائع کیں۔ چونکہ اس وقت اسلام کی طرف واپس لوٹنے کی تحریک شروع ہو چکی تھی اس سے عیسائی مشنریوں کے عزائم فسخ ہو گئے۔

پس اسلام ہمیشہ ہی مغربی عیسائی اقوام کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہوا ہے۔ ان کے تمام دنیا پر غلبہ حاصل کرنے کے منصوبہ میں ہمیشہ خطرہ سمجھا جا تا رہا ہے اور انہوں نے اپنے عزائم کو پورا کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اسلام کے خلاف نفرت ہندوستان میں بھی عیاں تھی۔ برطانوی راج کے دوران یہ بات کھل کر واضح ہوگئی کہ حکمرانوں کو ہندوؤں سے زیادہ انس تھا بجائے مسلمانوں کے جنہیں وہ حقیر خیال کرتے تھے۔ اس کی واضح مثال ارل ماؤنٹ بیٹن ہے جو ہندوستان کا آخری وائسرائے تھا۔ برطانوی ٹی وی کے چینل فور کے ایک حالیہ پروگرام بعنوان Secret Lives جو 9 / مارچ 1995ء کو دکھایا گیا تھا، مؤرخین اور سوانح نگاروں نے ماؤنٹ بیٹن کی ہندولیڈر جواہر لال نہرو کی بے جا جانبداری اور محمد علی جناح کے لئے نفرت پر کھل کر اپنی رائے کا اظہار کیا۔ مؤرخین نے ماؤنٹ بیٹن پر یہ الزام بھی عائد کیا ہے کہ اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو خانہ جنگی پر اکسایا تھا جس میں قریب قریب ایک ملین افراد موت کی آغوش میں چلے گئے، ان میں اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد جب وہ انگلستان واپس لوٹا تو ہر کسی نے اس کو ہیرو اور مرد اعظم کے طور پر اس کا استقبال کیا۔ ان میں حکمران لیبر پارٹی جس کا سربراہ ایٹلی تھا اور کنزرویٹو پارٹی والے شامل تھے۔ ان سب نے مل کر اس کو ہندوستان میں کامیابی حاصل کرنے پر مبارک باد پیش کی۔

کیا ایسی خانہ جنگی اکسانے پر جس میں تقریباً ایک ملین لوگ ہلاک ہو گئے، اسے ہیروازم کی مثال سمجھا جا سکتا ہے؟

لیکن وہی کچھ ہوا جو اس کے مقدر میں تھا۔ کیا یہ نا قابل یقین ستم ظریفی نہیں کہ تقریباً ایک ملین افراد کے قتل عام کے تیس سال بعد ارل ماؤنٹ بیٹن خود آئی آر اے (IRA) کے بم کا نشانہ بن کر ایک ملین ٹکڑوں میں ریزہ ریزہ ہو گیا۔ اس کی وضاحت یوں ہی کی جا سکتی ہے کہ یہ مغرب کے دو بالاتر فرقوں یعنی پروٹسٹنٹ اور رومن کیتھولک عیسائیوں کے درمیان خانہ جنگی کا نتیجہ تھا۔

مسلمانوں کی آزاد خیالی

عین اس وقت جب اسلام کی طرف واپس لوٹنے کی تحریک (بنیاد پرستی) شروع ہوئی، مغربی تعلیم تک رسائی ممکن ہوگئی اور مغربی مصنفین کی طرف سے اسلام کا منفی استحسان جب شروع ہوا تو مسلمان سکالرز کے ذہنوں میں آزاد خیالی نے جنم لینا شروع کر دیا۔ مستشرقین نے اس سے خوب فائدہ اٹھایا جنہوں نے یہ کہنے کی کوشش کی تھی کہ مسلمانوں کے اخلاق اور عادات و اطوار دگرگوں ہو چکے ہیں جس کی بڑی وجہ سخت اور کٹر اسلامی قوانین ہیں۔ مغربی معاشرہ میں قبولیت حاصل کرنے کیلئے انہیں بعض پرانی رسوم کو ترک کر دینا ہوگا اور انہیں مذہب کے بارہ میں اپنے قدامت پسند رویہ کو ڈھیل دینا ہوگی۔

گذشتہ صدی کے نصف سے لے کر موجودہ زمانے تک اسلامی طرز فکر کی بلا شبہ تشکیل نو ہوئی ہے۔ بعض قدامت پسند مصلح بھی پیدا ہوئے جن کا مطمح نظر یہ تھا کہ اسلام میں جو غیر اسلامی باتیں در آئیں ہیں ان کی تطہیر کی جائے نیز قرآن اور دَور قدیم کی روایات کی طرف رجوع کیا جائے۔ اس کے برعکس آزاد خیال مصلحین کی رائے میں دارالاسلام کی تطہیر اور تجدید وقتی تقاضوں کے ساتھ ساتھ ہونی چاہیئے۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں بعض آزاد خیال علماء بھی ہوئے، ان میں خاص طور پر جمال الدین افغانی (97-1839) محمد عبدہ (1905-1849) اور سر سید احمد خاں (98-1817) قابل ذکر ہیں جنہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے خیالات کو بہت متاثر کیا۔ برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان میں ایک طاقت ور ادارہ تھی اور اس کا کولونیل سامراج کے قیام میں حددرجہ عمل دخل تھا۔ اس کا مقامی باشندوں کی آبادی جو ہندوؤں، عیسائیوں اور مسلمانوں پر مشتمل تھی، گہرا اثر ورسوخ تھا۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا عوام الناس برطانیہ سے فرمانبرداری اور وطن سے حب الوطنی میں بٹ کر رہ گئے۔ کئی لوگوں نے جن میں ہندوستانی مسلمان بھی شامل تھے، فیصلہ کیا کہ انہیں اعلانیہ طور پر اظہار کر دینا چاہیئے کہ وہ تخت برطانیہ کے فرمانبردار ہیں۔ نیز یہ کہ ان کی نجات صرف مغربی علوم کے سیکھنے میں ہے۔ ان دو مقاصد کے مدّ نظر ان کو یقین ہو گیا کہ برطانوی حکومت بظاہر

زوال پذیر مغل حکومت سے بہتر ہے اور مزید یہ کہ اگر وہ فلاح و بہبود کے خواہاں ہیں تو ان پر یورپین سائنس اور علوم کی تحصیل لازم وملزم ہے۔

پھر بعض لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے ناسمجھی اور سادگی میں یہ فرض کر لیا کہ برطانوی عیسائی اسلام کو تباہ کرنے کے خواہاں نہیں بلکہ اس کے حقیقی خیر خواہ ہیں۔ اور وہ مسلمانوں کو معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی طور پر ترقی کرتے دیکھنا چاہتے ہیں۔لیکن انہوں نے ایک بہت بڑے خطرہ کو نہ بھانپا تھا جو ان کی ترقی کو روک دے گا یا فی الواقعہ ترقی کا آغاز ہونے سے پہلے ہی ختم کر دے گا۔

مسلمانوں کی مادی، معاشرتی اور علمی و ذہنی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ان کا مذہب کی طرف قدامت پسند رجحان تھا۔ اس لئے اس مسئلہ پر قابو پانے کے لئے آزاد خیال مصلحین نے دینِ اسلام کے بنیادی اعتقادات پر از سرِ نو غور کرنے کی ضرورت محسوس کی اور بعض پہلوؤں میں نرم برتاؤ کا پرچار کیا تا کہ اپنی لادینی امنگوں کے لئے جگہہ پیدا کر سکیں۔ اور جیسا کہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے جب اصولوں میں نرمی اور کسی طرح کا ڈھیلا پن آ جائے اور جب اصلی تعلیم سے انحراف شروع ہو جائے اور اپنے اعتقادات پر معذرت خواہی سے کام لیا جائے اور انسان سمجھوتہ کرنا شروع کر دے، تو گمراہی کے راستہ کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ آہستہ آہستہ مگر یقینی طور پر وہ قعر مذلت میں گر جاتے ہیں۔

سر سید احمد خاں سے عمر میں چھوٹے مگر ان کے ہمعصر مشہور ہندوستانی جدّت پسند سید امیر علی نے 1873ء میں 'سپرٹ آف اسلام' کے نام سے کتاب لکھی جو جلد ہی اسلامی آزاد خیالی کا دستور عمل بن گئی۔ کتاب کے ایک کثیر حصہ میں سرکارِ دو عالمؐ کے بعض ان افعال پر معذرت کی گئی ہے جن پر غیر مسلم محققین اکثر تنقید کرتے آئے ہیں۔ امیر علی مغربی مستشرقین کے جادو کا ایک اور شکار بن گیا۔ یہ اسی قسم کے آزاد خیال مفکرین ہی تھے جنہوں نے اسلام کی وحدانیت اور کڑی سادگی کا بہ نسبت یورپین طرز حیات کے قبول کرنے میں تناقض دیکھا۔ یہ اسی قسم کے آزاد خیال لوگ ہی تھے جنہوں نے جانتے بوجھتے اس بات سے آگاہ کیا کہ متعدد اسلامی قوانین فرسودہ ہو چکے ہیں اور موجودہ زمانے کے لئے موزوں نہیں۔ وہ اسلامی قوانین کو معنوی نہ کہ لفظی لحاظ سے قابل قبول سمجھتے

تھے۔امیر علی کے قول کے مطابق قانون کی روح کے معنی یہ ہیں کہ راستبازی سے پیار کیا جائے، اچھے اعمال بجالانے کی کوشش کی جائے، خدااوراس کی مخلوق سے محبت کا عملی نمونہ اختیار کیا جائے۔ وہ ترمذی کی ایک حدیث کا حوالہ دے کر ثابت کرتا ہے کہ سرور کائنات ﷺ نے اپنے قانون کو غیر مبدل قرار نہیں دیا تھا۔ اوراس توقع کا اظہار کیا کہ جونہی روحانیت میں ترقی بڑھتی جائیگی اس کے ساتھ ہی قانون کی پیروی کم سے کم تر ہوتی چلی جائیگی۔امیر علی کے خیال کے مطابق محمد ﷺ کے دئے ہوئے کئی قوانین وقتی حالات کے پیش نظر تھے جونہی حالات بدل گئے تو قوانین بھی کالعدم ہو گئے۔

ایسے نام نہاد مسلمانوں کے ذہنوں میں کس قسم کے ناقابل یقین خیالات اور تصورات نے جگہ پالی تھی؟ آزاد خیالوں کی نئی پود نے اسلامی نظریات کی تشکیل نو کی کوشش کی اور عیسائی مستشرقین کے ہاتھوں میں آلہ کار بن گئے۔انیسویں صدی کے نصف میں یہ اسی قسم کی آزاد خیالی تھی جس نے اسلام کی بنیادوں کو ایسا ناقابل بیان نقصان پہنچایا جس نے اس کو ہلا کر رکھ دیا۔علاوہ ازیں اسلام کے پاک پیغمبر ﷺ پر مغربی مستشرقین نے جو ظالمانہ اور کینہ پرور حملے کئے ان میں کوئی کمی یا تنزل ہوتا نظر نہیں آتا تھا۔ انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔ پس یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے اپنے مذہب کی پیروی کرنا دوبھر ہوگیا۔اس سے سرکار دو عالم ﷺ کی ایک پیش گوئی پوری ہوگئی کہ ایک وقت ایسا آئیگا کہ حقیقی اسلام کا کچھ بھی باقی نہ رہ جائیگا سوائے نام کے۔درحقیقت کئی مسلمانوں نے اپنا مذہب تبدیل کر لیا اور عیسائیت، ہندومت یا دہریہ پن کے پیروکار بن گئے۔آزاد خیالی کا ماحصل یہ ہے کہ برطانویوں کو جان بوجھ کر نہ چھیڑا جائے کیونکہ وہ تو اسلام کو نیست و نابود نہیں کرنا چاہتے بلکہ اس کے خیر خواہ تھے اور مسلمانوں کو کامیابی سے ہمکنار ہوتا دیکھنا چاہتے تھے۔

چودہ سو سال قبل نازل ہونے والا خدا کا کلام پھر ایک بار پوری صداقت سے پورا ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے تو پہلے ہی سے تنبیہ کر دی تھی کہ اہل یہود اور اہل نصاریٰ اللہ کے نور کو بجھانے کی سعی کریں گے(یعنی دین اسلام کو)۔سورۃ التوبہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے: يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَاللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ يَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ (9:32)

’’وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے مونہوں سے بجھا دیں۔ اور اللہ (ہر دوسری بات) ردّ کرتا ہے سوائے اس کے کہ اپنے نور کو مکمل کر دے خواہ کافر کیسا ہی ناپسند کریں‘‘۔

انیسویں صدی کے اواخر میں دشمنان اسلام محمد ﷺ کے دین کو بدترین حالت میں دیکھ کر اور اس پر ہر جہت سے ہندوؤں، عیسائیوں، آریوں اور دہریوں کے مشترکہ حملے ہوتے دیکھ کر ضرور خوشی کے شادیانے بجاتے ہوں گے۔ مسلمان اپنے مذہب پر تقریباً شرمندگی محسوس کرنا شروع کر چکے تھے اور اپنے عقائد کے کمزور عذر اور معذرتیں پیش کرنے لگے تھے۔

باب پنجم

مصلح وقت کا ظہور

اسلام بے شک اس وقت پست حالت میں تھا۔ مصلح زمانہ کے ظہور کے لئے یہ نہایت موزوں وقت تھا تا وہ تحفظ مذہب کا دعویٰ کرے اور اسلام کو اس کی اصلی حالت اور قرون اولیٰ کی شکل میں بحال کر دے۔ یوں اسلام کے پیغمبر ﷺ کی ایک دوسری پیش گوئی کا پورا ہونا مقدر تھا۔ قادر مطلق کا یہی منصوبہ تھا کہ جس طرح پر آنحضور ﷺ کی بعثت ایسے لوگوں میں ہوئی جو تاریک زمانہ کے تاریک ترین دور میں رہ رہے تھے اور جو دورِ جاہلیت کہلاتا تھا۔ اس وقت بنی نوع انسان روحانیت سے عاری ہو چکی تھی پس اسی طرح آج کے دور کے مصلح کا ظہور بھی ایسے لوگوں میں ہونا مقدر تھا جنہوں نے اسلام کو ماسوائے اس کے نام کے صفحۂ ہستی سے مٹا دیا ہوا تھا۔ بالکل جس طرح محمد (ﷺ) اس دور کا مرد کامل تھے اسی طرح مصلح زمانہ کا دین اسلام کے دفاع کے لئے ساز و سامان سے لیس ہونا ضروری تھا۔

مصلح وقت حضرت مرزا غلام احمد علیہ السلام نے مسیح اور مہدی موعود ہونے کا دعویٰ کیا جس کا ہر کسی کو انتظار تھا آپ احمدیہ مسلم جماعت کے بانی تھے۔ آپ نے اسلام کا مکمل طور پر دفاع کرنے کیلئے معقول، مؤثر اور دل موہ لینے والے دلائل اس کی صداقت کے ثبوت میں پیش کئے۔ آپ نے محمد ﷺ کو ناپاک حملوں سے بری ثابت کیا اور آنحضور ﷺ کا شریفانہ کردار جو اصلیت کا جیتا جاگتا نمونہ تھا اسے بدنما اور داغدار دھبوں سے صاف کیا۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ایک اور ایسا کارنامہ سرانجام دیا جو کسی دوسرے مسلمان نے سرانجام نہ دیا تھا اور وہ تھا عیسائیت کو اس کی بنیادوں سے جس پر اس کی تعمیر ہوئی تھی اکھیڑ دینا، یعنی تثلیث کا عقیدہ۔ آپ نے فی الواقعہ صلیب کو توڑ دیا اور یہ سب برطانوی حکمرانوں کی آنکھوں کے سامنے ہوا جو بزعم خود نصرانیت کے دفاع کے دعویدار تھے۔

حضرت مرزا غلام احمد علیہ السلام نے واشگاف اعلان کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات صلیب پر ہرگز نہیں ہوئی۔ عیسائیوں کیطرح دوسرے تمام قدامت پسند مسلمانوں کو بھی اس دعویٰ نے چونکا دیا جو اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کے ہمراہ آسمان پر زندہ موجود ہیں جبکہ ان کے اپنے پیارے محبوب نبی محمد ﷺ زمین میں مدفون ہیں۔

اس زبردست دعویٰ کے پیش نظر اس امر میں کوئی تعجب نہیں ہے کہ مرزا غلام احمد علیہ السلام پر مسلمانوں اور عیسائیوں نے باہم مل کر ہر طرف سے حملے کرنا شروع کر دئے۔ اگرچہ باقی مسلمانوں نے انہیں کوئی خاص وقعت نہ دی اور احمدیوں کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھ لیا، تاہم حضرت مرزا غلام احمدؑ کی آمد سے نیند کی آغوش میں پڑے مسلمانوں پر گہرا اثر ہوا۔ یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ ایک ایسا شخص جس کے پاس زیادہ وسائل نہیں تھے، کوئی مادی طاقت اس کی پشت پناہی نہیں کررہی تھی، وہ خود تن تنہا تھا، اس نے ایسے ناقابل یقین دعاوی عیسائیت کی بالا دستی کے خوف کے بغیر کر دئے؟ اس چیز نے ایک سے زیادہ طریقے سے دوسرے مسلمانوں کو ہمت اور یقین کامل بخشا کہ وہ اُٹھ کھڑے ہوں، اپنے ارد گرد دیکھیں اور اپنے دین کا دفاع شروع کریں۔ تحریک احیاء دین کی کئی ایک تحریکات چل پڑیں جن کا مقصد مذہب کی طرف لوٹنا تھا۔ اس وقت سے لے کر اب تک عموماً مگر خاص طور پر مذہبی شعور اور قدامت پسندی کی طرف لوگوں کا رجحان ہوگیا ہے۔ کئی ایک تو حد سے بڑھ گئے اور ضرورت سے زیادہ آگے بہت آگے نکل گئے ہیں۔

انہوں نے اپنے اوپر یہ فرض کرلیا ہے کہ قوم کو دنیاداری اور مغربیت کی طرف پھسلنے سے بچانا ہے جس کو وہ کفر اور فقدان اخلاق کے برابر سمجھتے ہیں۔ انہوں نے انقلابی رول ادا کرنا شروع کردیا ہے۔ پاکستان اور ایران اس عالمی رجحان کی دنیائے اسلام میں ڈرامائی مثالیں ہیں اور مذہبی قدامت پسندی کی طرف واپس لوٹنے کی مہم ایک نئی اور زبردست طاقت کی طرح محسوس کی جارہی ہے۔

مایوسی کا عالم اور مغرب کا خوف

یہ سب کچھ مغربی عیسائی اقوام کے لئے زبردست دھچکا کا موجب بنا ہوگا جن کے برے

عزائم اور تدابیر ایک دفعہ پھر سے ناکام ہو گئیں۔ انہوں نے سنجیدگی سے غور کیا ہوگا کہ سابقہ صدی کے اختتام پر انہوں نے اپنی کرتوتیں دکھا دیں اور اسلام کو ہادی برحق ﷺ کی طرح وفات یافتہ قرار دے کر اسے مدفون کر دیا تھا جبکہ عیسائیت بادلوں کے دوش پر عروج کی پرواز کرتے بظاہر نظر آ رہی تھی۔ لیکن مغرب کے لئے ابھی بدتر حالات مقدر تھے۔ پچھلی دو تین دہائیوں میں خصوصاً برطانیہ اور بعض دوسرے یورپین ممالک کے علاوہ امریکہ اور کینیڈا کی طرف تمام دنیا کے نسلی گروہوں کی بھاری تعداد میں نقل مکانی نے مغرب کے معاملات کو تہ و بالا کر دیا۔

یہ درست ہے کہ بعض نسلی اقلیتوں کے کلچر پر برتر مغربی کلچر مکمل طور پر چھا گیا تھا، ویسٹ انڈیز، افریقہ، مشرق بعید اور ہندوستان کے لوگوں نے مغربی طرز معاش میں گھل مل جانے کی کوشش کی ہے تا وہ مغربی معاشرے میں قبول کر لئے جائیں اور بنیادی طور پر انہوں نے غیر مداخلت کا رویہ روا رکھا ہے، یہ جان کر کہ جب روم میں ہو تو رومن لوگوں جیسا بود و باش اختیار کر لو۔ اگرچہ ان نو آبادکاروں نے اپنے بنیادی مذہب کو ایک حد تک محدود رکھا ہے تاہم انہوں نے معاشرتی پہلو سے مغربی عادات اپنالی ہیں۔ مثلاً مرد و عورت کا آزادی کے ساتھ میل جول کرنا، ان کے لباس کی طرح لباس پہننا، بلا روک ٹوک شراب نوشی کرنا، رقص کرنا اور جوا کھیلنا۔

اہل مغرب کا خیال تھا کہ شاید بھولپن کی وجہ سے مسلمان بھی گمراہ ہو کر اپنے دین سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے اور صراط مستقیم سے بھٹک جائیں گے اور اسلام کا نام رفتہ رفتہ پارہ پارہ ہو جائیگا۔ لیکن اہل مغرب کو کف تاسف ملنا پڑا اور اسلام نے بنیاد پرستی کی طرف ڈرامائی انداز میں منہ موڑ لیا۔ قانون، اقتصادیات، اور خاص طور پر تہذیت میں بنیاد پرستی۔ اسلام کے اس احیاء کے ذریعہ ابتدائی دور کے اسلام کی طرف واپس جانے کا رجحان پیدا ہو گیا۔ نہ صرف اسلامی ممالک میں بلکہ مغرب میں بھی، مغربی عیسائی اقوام کی سرزمین کے عین درمیان۔ محلّہ کی مسجد میں امام الصلوۃ کا سماجی درجہ ایک حد تک بہتر ہو گیا اور اس کے نقطۂ نظر کو نہایت درجہ تکریم کے ساتھ سنا جانے لگا۔

اس مذہبی ماحول میں سرگرمی کا ایک اور پہلو یہ نکلا کہ مذہبی طلباء کی انجمنوں نے پروان چڑھ کر مقبول عام ہونا شروع کر دیا۔ ان انجمنوں نے مغرب کے خلاف کئی ایک مظاہروں کا انتظام و انصرام کیا۔ یاد رہے کہ ایسے تمام مظاہرے حقیقی طور پر اسلامی نہیں ہیں لیکن ان سے مذہب کے

ساتھ لوگوں کے لگاؤ کا اظہار ہوتا ہے اور یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جس سے انہیں اپنی شخصیت کی پہچان کا احساس ہوتا ہے۔

اسلامی بنیاد پرستی کی طرف واپسی سے عورتوں کے مقام پر نمایاں اثر پڑا ہے۔ برقعے کا پھر سے فیشن ہو گیا۔ اسلام میں عورت کے مزعومہ درجہ دوم کے شہری ہونے کے متعلق اہل مغرب کی جانب سے شدید پراپیگنڈہ کے باوجود مغرب میں گزشتہ دہائی میں عورتیں اس تعداد میں حلقہ بگوش اسلام ہو رہی ہیں کہ اہل مغرب کے لئے یہ سب سے زیادہ باعث تشویش اور خطرہ کا معاملہ بن گیا ہے اور وہ اس کی روک تھام کی ضرورت شدت سے محسوس کرنے لگے ہیں۔

نکتہ نزاع

نسلی اقلیتوں کے خلاف برطانویوں کو سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ وہ ان کے ملک میں رہنے اور آباد ہونے کی نیت سے آتے ہیں مگر وہ اپنے میزبان ملک کے اطوار اور طریقوں کو اپناتے نہیں تاکہ وہ نئی سوسائٹی میں آسانی سے قبول کئے جاسکیں۔ خواہ قبول ہونے کا مطلب یہ ہو کہ وہ اپنی بعض یا تمام پرانی روایات اور مذہبی اعتقادات کو خیر باد کہہ دیں۔ اس کا ہدف علی الخصوص برطانوی مسلمان ہیں جنہیں وہ ضدی اور مغربی تہذیب کے طرز کی سوسائٹی کے قیام میں رکاوٹ سمجھتے ہیں۔

اہل مغرب کو مسلمانوں کی جو فکر اور تشویش لاحق ہے وہ حقیقی ہے۔ انہیں پتہ ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت جو مغرب میں سکونت پذیر ہے وہ اس کو خدا کا منکر معاشرہ سمجھتے ہیں۔ اسلام ایسی روحانی رہنمائی مہیا کرتا ہے جو دوسرے مذاہب فراہم نہیں کر سکتے۔ انہیں یہ فکر بھی لاحق ہے کہ جب مؤذن مومنین کو نماز کے لئے بلاتا ہے تو اس کی آواز میں گرجا گھر کی گھنٹیوں کی آواز گم ہو جاتی ہے۔ ایسے مسلمان جو مغرب میں رہائش پذیر ہیں، اقدار کے معیار کو محفوظ کرنے اور دنیا کا اسلامی زاویہ نگاہ محفوظ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

بلاشبہ مسلمان چاہتے ہیں کہ ان کو (بہ حیثیت) انسان پسند کیا جائے، وہ گھل مل جانا چاہتے ہیں، اور (زندگی میں) کامیابی سے ہمکنار ہونا چاہتے ہیں۔ لیکن ان تمام باتوں سے بڑھ کر وہ

مسلمان رہنا پسند کرتے ہیں۔ یہ وہ دکھتی رگ ہے جو مغربی عیسائیوں کے احساسات کو ٹھیس پہنچاتی ہے۔وہ مسلمانوں کے روحانی اقدار سے دلی لگاؤ کو جو آجکل مغرب میں نہ ہونے کے برابر ہے ایک گہری حسد کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

وہ لوگ جو مسلمانوں کے خلاف ایسے خیالات اپنے دل میں رکھتے ہیں ان کیلئے بہتر ہوگا کہ وہ رائے ہیٹرس لی (Roy Hattersley) کے اس تبصرہ سے استفادہ کریں ۔ رائے ہیٹرس لی ایک مقبول عام، برطانوی پارلیمنٹ کا باعزت رکن ہے۔اس نے سنڈے ٹائمز (16 جون 1993) میں ایک مضمون لکھا تھا جس میں اس نے ونسٹن چرچل کے برطانیہ میں مختلف نسلوں کے امتزاج کے بارہ میں نظریات کو چیلنج کرتے ہوئے درج ذیل رائے پر اپنے مضمون کو ختم کیا: "ایک بات تو یقینی ہے......مسلمان اب برطانیہ میں ہی مقیم رہیں گے، وہ یہاں رہیں گے اور استقامت کے ساتھ اسلامی روایات اور رجحانات کے ساتھ رہیں گے۔وہ برطانیہ کی لادین سوسائٹی میں گھل مل نہیں جائیں گے اور نہ ہی دوسروں سے مطابقت پیدا کرنے کی خاطر جعلی پردہ کے پیچھے چھپ جائیں گے۔یا تو ہم ان کی خوبیوں کو سراہ سکتے ہیں ان کی اچھائیوں پر مزید کام کر سکتے ہیں، ان کے ساتھ اختلافات کو تسلیم کر سکتے ہیں ، یا پھر ہم شک وشبہ والا، خوفزدہ اور بے ذائقہ ماحول پیدا کر سکتے ہیں۔عام سوجھ بوجھ اور ہمدردی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اختلافات کو قبول کرتے ہوئے شادمانی کے ساتھ زندگی بسر کریں۔"

ایک موازنہ

آیئے اب ہم تصویر کے دوسرے رخ کو لیں اور اہلِ مغرب کے کردار پر طائرانہ نظر ڈالیں کہ وہ خود کس حد تک ان ممالک کے رسوم اور اعتقادات کو اپنا سکے جن پر وہ حکومت کرنے گئے اور حکومت کی۔علی الخصوص اس میں عیسائی پادریوں کا کردار کیسا تھا؟۔مغربی پادری مسلمان ممالک میں بادشاہتوں کی چھتری تلے حفاظت پا کر داخل ہوئے۔ابتداء میں یہ طریقہ ان کے لئے بہت سودمند ثابت ہوا اور اسلامی ممالک میں مشن قائم ہو گئے۔تاہم موجودہ حالات میں یہ طریقہ بوجھ ثابت ہو رہا ہے کیونکہ اکثر مغربی مشنریوں اور موردنفرت مغربی سامراجیت کو لوگ ایک ہی سکے کے

دورخ سمجھتے ہیں۔

اس سے پہلے اور اب بھی مغربی مشنریوں کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ وہ ثقافتی باڑوں میں مل جل کر رہنے کو پسند کرتے ہیں۔ جس ملک میں وہ رہائش پذیر ہوتے ہیں اس کی تہذیب کو فی الواقعہ جاننے کی کوشش نہیں کرتے جیسا کہ ڈاکٹر علی نے کھلے بندوں اعتراف کیا ہے۔ کم از کم اسے تو معلوم ہونا چاہیئے کیونکہ وہ خود ایک عیسائی مشنری ہے جس نے اپنے کیریئر کی ابتداء ایک مسلمان ملک میں کی تھی۔ وہ کہتا ہے "اگرچہ وہ (عیسائی مشنری) ایک مسلمان ملک میں رہائش رکھتے ہیں لیکن وہ اس قسم کا رویہ اپنائے رکھتے ہیں گویا وہ ابھی تک مغربی یورپ یا شمالی امریکہ میں رہ رہے ہوں"۔ (*Islam, A Christian Perspective*, page 154) ڈاکٹر علی مزید اعتراف کرتا ہے "مغرب نے سامراجیت کے ذریعہ جو تسلط اور کالونیل استحصال کیا ہے (تاریخ اس کی شاہد ہے)" (صفحہ 155)

یہ دلیل اور بھی وزنی ہو جاتی ہے کیونکہ یہ ایک عیسائی مشنری کے قلم سے نکلی ہے جو ایک ایسے ملک میں پیدا ہوا جس پر اہل مغرب کا گہرا اثر و رسوخ تھا اور انہیں کے تبلیغی مشن کی پیداوار ہے۔ ڈاکٹر علی مزید کہتا ہے: "اس نکتہ کی نشاندہی کرتے ہوئے کہ تارکین وطن کو کسی ملک کے غریب ترین طبقہ کے ساتھ مل بیٹھنا ان کے کام کا حصہ تو بنایا جا سکتا ہے لیکن اسے کسی لحاظ سے بھی مقامی تہذیب کے ساتھ یکسانیت کے ساتھ خلط ملط نہیں کرنا چاہیئے۔ یہ مفروضہ بذات خود گستاخی کی نشاندہی کرتا ہے جس کا مطلب یہ لیا جا سکتا ہے کہ مشنری تہذیب ہی ہمیشہ برتر ہوتی ہے اور یہ کہ مہمان تہذیب کے ساتھ یکسانیت پیدا کرنے سے احساس محرومی پیدا ہوتا ہے............تاہم کئی ایک مشنری ملک کی مقامی زبان کا سطحی علم رکھنے سے آگے نہیں جاتے جس میں وہ زندگی گزار رہے ہوتے ہیں جس کی خدمت کے لئے انہیں بلایا گیا تھا۔ انہیں اس ملک کے علمِ فنون، موسیقی اور علمِ ادب کی کوئی شدھ بدھ نہیں ہوتی"۔ (صفحہ 155)

ڈاکٹر علی قوم پرست عیسائیت کی ایک قسم، جو اپنی فطرت میں ہی اپنے اندر جھانکنے والی اور جاہلیت پر مبنی ہے، اس سے پیدا ہونے والے حقیقی خطرات سے بخوبی آگاہ ہے۔ کیا یہ موازنہ حیران کن نہیں ہے؟ جب مغربی طاقتیں دوسرے ممالک میں جا کر بس گئیں جس میں مسلمان

مما لک بھی شامل ہیں تو انہوں نے حکمران کی حیثیت سے اپنی برتری کو ان پر ٹھونسا مگر اپنی تہذیب کو محفوظ رکھا۔ وہ اپنے سماجی حلقوں میں محدود رہے، لیکن اب جبکہ مسلمان دوسری قومیتوں کے ساتھ مغرب میں بسنے کیلئے آئے ہیں، بلکہ یہاں خدمت کرنے آئے ہیں اور قانون کی پابندی کرنے والے شہریوں کے طور پر معروف ہیں تو پھر ان کا انتخاب الزام تراشی کے لئے کرلیا جا تا ہے کہ وہ مغربی تہذیب اور بود و باش کو اختیار نہیں کرتے۔ ان پر باڑے (مخصوص بستیاں) بنانے کا الزام لگایا جا تا ہے اور یہ اعتراض کیا جا تا ہے کہ وہ اپنے تک محدود گروہوں کی صورت میں رہتے ہیں۔ کیا یہ انصاف پسندی ہے؟ ہرگز نہیں۔

باب ششم

فکر اسلامی کی تشکیل نو کے منصوبے

کالونیل ہندوستان میں فکر اسلامی کی تشکیل نو کی طرف لوٹتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ اہل مغرب جو پہلے آزما چکے تھے وہ یہ تھا کہ اس دور کے مسلمان آزادخیال علماء کو اسلام کو مغربیت کی طرف لے جانے والے ذرائع اور وسائل کے اظہار کی کھلی چھٹی دے دی، تاکہ اسے اس طرح تسلیم کرلیا جائے جیسے یہ مسلمانوں کی اہل مغرب کے سامنے عذرخواہی ہو۔ مزید یہ کہ جس بات کو اہل مغرب جھٹلا نہیں سکتے وہ یہ ہے کہ فکر اسلامی کی تشکیل نو کے مکار منصوبہ کو ان کی مکمل پشت پناہی حاصل تھی۔ ڈاکٹر مائیکل نذیر علی نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے:" جب ہم مشرق وسطیٰ سے ہندوستان کی طرف رجوع کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ وہاں پر مسلم جدت پسندی یورپ کے اثرورسوخ کے ردعمل کے طور پر شروع نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ تقریباً اس کی سرپرستی میں ایسا ہوا تھا۔"
(Ali, *Islam - A Christian Perspective*, page 107)

ان کی تمام کوششوں اور پشت پناہی جو اسلام کو آزادخیال بنانے کے منصوبہ کے پیچھے تھی اور جس کی ابتداء پُرتوقع تھی، کے باوجود یہ منصوبہ بری طرح ناکام ہوگیا۔ جس کی بڑی وجہ یہی ہوسکتی ہے کہ آزادخیالی کو مغرب کے اونچے طبقہ کے لوگوں نے ہی توجہ دی اور علماء میں قبولیت نہ حاصل کرسکی۔ ایک اور وجہ جس کا اعتراف ڈاکٹر علی نے کیا ہے وہ یہ ہے کہ:"اس دور کی مسلم آزادخیالی کے مخاطب یورپ کی ذہنیت رکھنے والے لوگ ہی تھے، عالم اسلام میں اس کی ناکامی کا سبب اسی میں مضمر ہے۔"(صفحہ 139)

پس یورپ کا حال کچھ ایسا تھا کہ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔ فکر اسلامی کی تشکیلِ نو کیلئے ان کا منصوبہ قریب قریب چل پڑا جس کیلئے پہلے انہوں نے اپنے مستشرقین کو استعمال کیا جن کے فریب کار فیشن نے جادو کا استعمال قلم سے کیا وہ ایک طرف تو سرکار دوعالم ﷺ کی مدح ثنائی کرتے اور دوسری طرف انہیں سولی پر چڑھا دیتے۔ اس کا ہدف زیادہ تر مغربی دنیا کے عوام تھے

تا کہ وہ اسلام کو نظر استحسان سے دیکھنے سے اعراض کریں۔انہیں یہ تشویش لاحق تھی کہ لوگ ہزاروں کی تعداد میں حلقہ بگوش اسلام ہو رہے ہیں۔

دوسرے انہوں نے مسلمانوں کو نشانہ بنانے کے واسطے مسلمانوں کے اپنے ہی علماء کو استعمال کیا جنھوں نے اپنی سوچ میں آزاد خیالی دکھائی تھی۔اور اس مقصد کے لئے ان کا استحصال کیا تا کہ ان کی اپنی صفوں میں قدامت پسندی میں نرمی پیدا کی جا سکے۔جب یہ منصوبہ بھی نا کام رہا تو ایک نئے اور زیادہ شیطانی منصوبہ کی تیاری کی گئی۔جو گزشتہ تمام منصوبوں کو ملا کر ان سے زیادہ عیار اور فریب میں ڈالنے والا تھا۔انہوں نے اس کی تیاری میں دلجمعی سے وقت صرف کیا تا کہ اس سے حتی المقدور نقصان پہنچایا جا سکے۔

مسلمانوں کی آزاد فکر خیالی کی تشکیل نو کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی اور اس نئی آزاد خیالانہ تعبیر کے لئے ضروری تھا کہ وہ ملاؤں اور دوسرے انتہا پسندوں کے وضع کردہ قدامت پسند پروگرام کا معقول متبادل پیش کریں۔پس وہ کون نیا آزاد خیال عالم ہو سکتا تھا جو اسلامی نظریات میں انقلابی تبدیلی پیدا کر دے تا کہ اس سے اہل مغرب اور عیسائیت فائدہ اٹھا سکیں۔ایسے نظریات جو روبہ تنزل تھے اور ابھی بھی ہیں۔ڈاکٹر علی نے اس نئے آزاد خیال عالم کے بارہ میں اظہار خیال کرتے ہوئے اس کے کردار کو یوں بیان کیا ہے:" نئے آزاد خیال شخص کیلئے ضروری تھا کہ وہ بنیادی طور پر عالم اسلام سے مخاطب ہو، اسے سامراجیت کے خلاف کارفرما قوتوں کا محاسبہ کرنا ہوگا، جو آج کی دنیا کا حصہ ہیں"۔(صفحہ 139)

نیا آزاد خیال سکالر

مستشرقین کی تمام سابقہ تصانیف دینی علماء کے فائدہ کیلئے لکھی گئیں تھیں جن کا طرز تحریر پیچیدہ اور تاریخی زاویہ نگاہ تک محدود تھا۔ہادی برحق ﷺ پر جو اہانتیں اور تہمتیں لگائی گئی تھیں ان میں سے اکثر کو احتیاط کیساتھ چھپا لیا گیا تھا تا کوئی وسیع پیمانے پر شوروغوغا نہ کر سکے۔انہوں نے بہ یک وقت اسلام کا مسخ شدہ اور مبہم تصور پیش کیا۔اسلام اور اس کی برگزیدہ ہستیوں کو منفی پہلو اور فاسق و فاجر کے طور پر پیش کرنے کیلئے ضروری تھا کہ ایک افسانہ نگار کے فن کو استعمال میں لایا جائے

جو اپنے ہیجان خیز طرزِ تحریر سے زیادہ سے زیادہ عوام الناس پر اثر ڈال سکے۔ بفرض محال اگر معاملہ بگڑ بھی جائے تو انسان یہ عذر تراش لے کہ یہ تو افسانہ طرازی پر مبنی تصنیف تھی۔

پس ایک موزوں امیدوار کی تلاش شروع ہوگئی جو مغرب کے ذلیل منصوبوں کے معیار پر پورا اترتا ہو۔ اس معمہ کے آخری ٹکڑے نے ابھی ابھرنا تھا۔ بہتر ہوگا کہ ایسا آزاد خیال شخص بھارت یا پاکستان سے ہو، وہ صرف نام کا مسلمان ہو، وہ مغرب کے اونچے طبقہ کا ممبر ہو اور اگر وہ ممتاز قلم کار ہو تو اور بھی بھلا۔ اس کام کیلئے بیج شاید سالہا سال قبل یا شاید صدیوں قبل بو دیئے گئے تھے اور اب اس کا زہریلا پھل پک کر تیار ہو چکا تھا۔ ان کا مقصود شاطر کھلاڑی تھا مگر وہ تاش کے پتوں کا جوکر ثابت ہوا۔ بعد میں حقائق نے ثابت کر دیا کہ یہ کوئی مذاق نہیں تھا اور تمام متفکر لوگوں کے لئے یہ کوئی معمولی سا معاملہ نہیں تھا۔ بلکہ معاملہ بالکل اس کے برعکس ثابت ہوا۔ دنیا بھر کے غیر مسلم بھی اپنی زبان کے ذخیرہ الفاظ میں ایک نئے لفظ کا اضافہ کرنیوالے تھے۔ قطع نظر اس کے کہ وہ کون سی زبان بولتے تھے اور وہ لفظ تھا فتویٰ۔ سلمان رشدی کے لئے سٹیج تیار ہو چکا تھا جو تمام شرائط پر پورا اترتا تھا۔ سیبوں کے ڈھیر میں گندے سیب بھی ہوتے ہیں لیکن اہل مغرب نے ڈھیر کے بالکل نیچے جا کر سب سے متعفن سیب رشدی کی شکل میں نکالا۔ مزید برآں اس گندے سیب کو باقی ماندہ دنیا کے سامنے رکھ دیا تا وہ یہ کہہ سکیں کہ اسلام میں اس طرح کے 'سیب' رفتہ رفتہ عمومی شکل اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ میں اس موضوع کی طرف لوٹ کر آؤں گا۔

اسلام اور خود کفالت

اسلام کو موردِ تنقید ایک اور وجہ سے بھی بنایا جاتا ہے کہ یہ خود کفالت کا پرتو ہے۔ مغربی مستشرقین نے ہمیشہ ہی مسلمانوں کی ایسی تصویر کشی ہے کہ وہ اسلام میں اپنے اعتقادات اور تعلیمات میں اندھادھند پیروی کرتے ہیں۔ اور یہ کہ اسلام ان کی روحانی اور مادی ضروریات پوری کرنے میں خود کفیل ہے۔ دلیل وہ یہ پیش کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو دوسروں کے اعتقادات کا علم حاصل کرنے سے منع کیا جاتا ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ انہیں عام انسان کی ذہنی صلاحیتوں پر اعتبار نہیں کہ وہ سچ اور جھوٹ میں فرق کر سکتا ہے۔ منٹگمری واٹ اپنی کتاب میں اس خیال کی تاریخ

نبی پاک ﷺ کے دور میں جا نکالتا ہے:

" کئی ایک احادیث اور ابتدائی دَور کے مسلمانوں کے واقعات ایسے پائے جاتے ہیں کہ جن سے اس اصول کو تقویت ملتی ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ مذہبی امور پر بحث کرنا خوشگوار نہیں۔ جب خلیفہ عمرؓ محمد (ﷺ) کے پاس یہودیوں یا عیسائیوں کی ایک کتاب لے کر آئے تو مؤخرالذکر ناراض ہو گئے"

(*Muslim-Christian Encounters*, page 43)

سر ہیملٹن گب (Sir Hamilton Gibb) اس زاویہ نظر سے ایک قدم اور آگے نکل گیا ہے۔ وہ اپنی کتاب میں کہتا ہے کہ علماء کے لئے اسلامی تاریخ کو پیش کرنے کے لئے 'مذہبی اجازت نامہ حاصل کرنا ضروری ہو گیا۔ تا کہ اس کے بارہ میں اگر سوال اٹھایا جائے تو اسے کفر سمجھا جائیگا'۔

(*Modern Trends in Islam*, University of Chicago Press, 1947, page 125)

انہوں نے اسلام کی کیسی مسخ شدہ اور غلط تصویر پیش کی ہے؟۔ یہ محمد (ﷺ) ہی تھے جنہوں نے نہ صرف اہل کتاب کے ساتھ بلکہ کفار کے ساتھ بھی رواداری اور تکریم کے ساتھ برتاؤ کا سب سے بڑا عملی نمونہ پیش کیا۔ سرکار دو عالم ﷺ نے نہ صرف مذہبی امور میں رواداری سے کام لینے پر زور دیا بلکہ انہوں نے ایک بلند معیار قائم کیا۔ مثال کے طور پر ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔

"عیسائی قبیلہ نجران کے ایک وفد نے مدینہ میں آپ (صلعم) سے ملاقات کی تا کہ مذہبی امور میں تبادلہ خیالات کر سکیں۔ وفد میں چرچ کے کئی عمائدین بھی شامل تھے۔ گفتگو مسجد (نبوی) میں ہوئی اور کئی گھنٹوں تک جاری رہی۔ ایک مرحلہ پر آن کر وفد کے عمائدین نے مسجد سے باہر جانے اجازت چاہی تا کہ کسی مناسب جگہ پر عبادت کر سکیں۔ سرکار دو عالم (صلعم) نے فرمایا کہ انہیں مسجد سے باہر جانے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ وہ تو خدا کی عبادت کی جگہ ہونے کی وجہ سے مقدس ہو چکی ہے اور انہیں مسجد ہی میں عبادت کر لینی چاہئے۔" (زرقانی)

یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ نبی پاک ﷺ کی زندگی میں ہونے والے متعدد واقعات میں سے یہ ایک واقعہ ایسا ہے جس میں تکریم اور رواداری کو اپنی بلندی کو چھوتے دیکھا گیا ہے۔ اس کی نظیر کسی دوسرے مذہب یا پیغمبر میں نہیں ملتی۔ یہ اسلام کی آفاقیت کے خلاف محض حسد و کینہ اور اس

کی خود کفالت کا خوف ہے جو عیسائیوں کے ذہنوں پر حاوی ہے اور ان کے لئے سخت تکلیف اور دکھ کا باعث بنا ہوا ہے۔ ان کے حقیقی خوف کو منٹگمری واٹ نے بھی واضح کیا ہے۔ وہ کہتا ہے: "جب بھی کوئی تاریخ عالم کو جو مسلم سکالرز نے قرآن کریم میں بیان کئے ہوئے شعور سے لکھی ہے سامنے رکھ کر دیکھتا ہے تو اس کے لئے اسلام اور عالم اسلام کے ماوراء جو کچھ بھی ہے اس میں مسلمانوں کی دلچسپی کی کمی ہرگز باعث حیرت نہیں ہوگی۔ چونکہ محمد خاتم النبین تھے اور اسلام آخری مذہب اس لئے تاریخ ایک تسلسل سے دنیا بھر میں اسلام کی آخری فتح کی طرف حرکت کر رہی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ عیسائیت بالآخر شاید مکمل طور پر زیرنگوں ہو جائیگی"

(Watt, *Muslim-Christian Encounters*, page 49)

شاید یہی خوف اور اصل وجہ تھی جس نے مغربی مستشرقین کو جنم دیا۔ جیسا کہ منٹگمری واٹ اِسی محوّلہ بالا کتاب میں برملا اعتراف کرتا ہے: "یورپین کالونیاں بنانے والوں کی کئی ایک تصانیف کا مقصد اسلام کو بہتر طور پر سمجھنا تھا تا وہ اسے بہتر طریق سے کنٹرول کر سکیں...... کالونیاں بنانے والوں کی طاقت کے زیرسایہ عیسائیوں نے اپنے طور پر کئی گروپ بنالئے ...... یہ ان کی بیوقوفی ہوتی اگر وہ کھلے عام اسلام کو ہدف تنقید بناتے یا اس کا مسخ شدہ تصور قائم کر لیتے جس طرح کہ مغربی یورپ میں قائم ہو چکا تھا" (صفحات 73-72)

منٹگمری واٹ کے تبصرہ جات کو نوٹ کرنا دلچسپی سے خالی نہیں کیونکہ اس کا شمار مغربی مستشرقین کے دیوتاؤں میں ہوتا ہے اور یہاں وہ صاف صاف بیان کرتا ہے کہ مستشرقین کا مقصد اسلام کو کنٹرول کرنا تھا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا اور یہ تمام دنیا میں پھیل رہا تھا۔ وہ مزید تسلیم کرتا ہے کہ مغربی ناقدین اسلام نے یورپ میں اس کا مسخ شدہ تصور قائم کر رکھا تھا۔

باب ہفتم

مغربی مستشرقین

اب میں اس صدی کے چند مغربی مستشرقین کا جائزہ لے کر ان کی تصنیفات کا موازنہ پیش کروں گا جس سے یہ روز روشن کی طرح واضح ہو جائیگا کہ ان تمام کتابوں کا ماخذ ایک ہی ہے۔ سرکار مدینہ ﷺ، آپ کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم، قرآن پاک اور احادیث نیز وہ تمام امتیازی خصوصیات ونمایاں صفات جن کا اسلام سے ذرا سا بھی تعلق تھا سب پر ایک جیسے الزامات لگا کر ان کو نشانہ استہزا بنایا گیا ہے۔

مزید برآں جس بات کا پتہ چلتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ لوگ فریب کاری سے کام لیتے ہوئے اپنا موٴقف پیش کرتے ہیں۔ ایک جگہہ پر وہ سرکار دو عالم ﷺ کے بارہ میں تعریفی کلمات کہتے تو اس کے معاً بعد وہ انہیں صلیب پر چڑھا دیتے ہیں۔ منافقت ان کی تحریروں کا امتیازی وصف ہے اور اس کا استعمال اس وقت سے جاری ہے جب اسلام پر ابتدائی علمی حملے ہونا شروع ہوئے تھے۔

میکسیم روڈنسن (Maxime Rodinson)

فرانسیسی مستشرق میکسم روڈنسن پیرس میں یہودی مزدوروں کی ٹریڈ یونین کے بانی کا بیٹا تھا۔ روڈنسن نے بعد میں کمیونسٹ پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی اور دہریہ ہو گیا۔ اس کی سب سے مشہور اور متنازع سادہ سے عنوان والی تصنیف کا نام 'محمد' ہے۔ کتاب 'محمد' میں ساتویں صدی کے عرب معاشرہ پر اسلامی نظریات کے اثر کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

اس کتاب میں وہ نبی پاک ﷺ کے کارناموں کو ان کے دور کے آئینہ میں دیکھتا ہے لیکن کتاب میں آپ کے پاک کردار اور اسلام کی شریف النفس شخصیات پر ہتک عزت اور بہتان تراشی والے حملے یکے بعد دیگرے کئے گئے ہیں۔ یہاں تک کہ آنحضرت ﷺ کی ولادت کا واقعہ بیان کرتے ہوئے بھی اُکسانے کی کوشش کی گئی ہے جب ان کے والد محترم کو جنسی اشتہاء

رکھنے والا بنا کر پیش کیا گیا جو ایک کے بعد دوسری بیوی کے پاس جنسی تشفی کے لئے جاتا رہتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کے بچپن کے واقعات کو غیر معتبر اور ان کا حوالہ فرضی کہانیوں کے طور پر دیا گیا ہے۔ یہ کہانیاں وقت گزرنے کے ساتھ زیادہ خوبصورت اور روحانی طور پر بہتر ہوتی چلی گئیں (صفحہ 143)۔ روڈنسن لکھتا ہے کہ زمانہ نبوت سے پہلے محمد (صلعم) اپنے آباء والے مذہب کی پیروی کرتے تھے۔ وہ مزید کہتا ہے کہ انہوں نے العزیٰ کی دیوی پر ایک بھیڑ کا چڑھاوا چڑھایا تھا۔ (صفحہ 48) وہ احادیث کو مفروضی سمجھتا ہے اور ان کے بارہ میں جعلسازی کے لفظ استعمال کرتا ہے۔

نبی پاک ﷺ پر الزامات

اس کتاب میں آنحضرت ﷺ کو دیوانہ، عارف، کاہن (قسمت کا حال بتلانے والا) انقلابی، اور وہ جس کو مرگی کے دورے پڑتے ہوں کہا گیا ہے۔ (صفحہ 57-53)۔ روڈنسن یہ بھی کہتا ہے کہ مثال کے طور پر اٹھارویں صدی کے عقلیت پسند فلسفی بھی عذر خواہ عیسائیوں اور علمائے دین کی طرح محمد کو 'باکمال فراڈ' کی عمدہ مثال کے طور پر دیکھتے ہیں۔ (صفحہ 76)

جب اسلام کا آغاز ہوا اس وقت بلاشبہ عرب کے ملک کی حالت تاریخ عالم میں بدترین سمجھی جاتی تھی۔ ناقدین نے اس قسم کا تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ اس زمانہ کے اثرات کا محمد (صلعم) اور آپ کے صحابہؓ پر بھی ضرور اثر ہوا ہوگا۔ جبکہ روڈنسن مزید لکھتا ہے: "وہ (محمد) جس دور میں رہتا تھا اور اُن عربوں کی جن کی اس نے قیادت کرنی تھی ان کی ناشائستہ فطرت کے پیش نظر انہیں مرعوب کرنے کے لئے اسے فراڈ کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔" (صفحہ 76)

جہاں تک اسلام کے ابتدائی سالوں میں جنگوں کا تعلق ہے محمد (صلعم) کو جارح کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ ایسا جارح جس نے جنگی قیدیوں پر کوئی رحم نہ کیا اور وہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے سب کچھ کر گزرنے کیلئے تیار رہتا تھا۔ روڈنسن لکھتا ہے: "وہ رضا کار جس نے آپ کو قتل کرنا اپنے ذمہ لیا تھا، اس نے پیغمبر اسلام سے وضاحت کی کہ فریب کاری، عیاری، اور جھوٹ کا سہارا لینا ضروری ہے۔ محمد نے اس کو قابل اعتراض نہ سمجھا۔" (صفحہ 176)۔ آنحضور ﷺ کو اس طور سے پیش کیا گیا ہے کہ ان میں صبر نام کا بھی نہیں تھا اور وہ ہمیشہ غصہ میں بپھرے رہتے تھے اور اس وجہ

سے اپنے دشمنوں کے خلاف وحشیانہ عمل سرزد کرتے تھے۔ وہ کہتا ہے:"ہم نے دیکھا ہے کہ محمد کے پاس بعض ایسے دیوانے نوجوان کارندے تھے جو عملاً اس کی انگلیوں کے اشاروں پر ناچتے تھے۔ جو اس موقعہ ملنے کے انتظار میں رہتے تھے کہ جہاں کہیں بھی ضرورت پڑے مخالفت کو کچل کے رکھدیں۔"(صفحہ 224-223)۔ پھر وہ مزید لکھتا ہے:"محمدؐ نے اپنے چیلوں کو مکمل آزادی دے رکھی تھی۔"(صفحہ 184)

روڈنسن کمینگی میں کس قدر گر گیا ہے کہ نبی پاک ﷺ کی پاک زندگی کے حقائق وواقعات کو بیان کرنے میں وہ مکاری اور تصنع سے کام لیتا ہے۔ میکسم روڈنسن دوسرے مستشرقین سے چنداں مختلف نہیں ۔ یہ سب ایک ہی قبیل کے ہیں جب وہ دوسروں کی ہاں میں ہاں ملا کر نبی پاک ﷺ پر تہمت لگا تا ہے کہ وہ (نعوذ باللہ) اوباش تھے۔ آپ (صلعم) پر الزام تراشا گیا ہے کہ انہیں نوجوان اور پری پیکر عورتوں کی خواہش رہتی تھی:" اگرچہ ہم جانتے ہیں کہ زندگی کے اواخر میں اس میں عشق لڑانے کا میلان ہو گیا تھا ہم بمشکل تصور کر سکتے ہیں کہ ایسے کئی مواقع پیدا نہیں ہوئے ہوں گے جب......اس نے دل میں (کسی سے) زنا کر لیا ہو"۔(صفحہ 55)

ماسوا چند قابل تکریم استثناؤں کے اہل مغرب نے وہ سب کچھ نظر انداز کر دیا جو چودہ صدیوں سے رسول کریم ﷺ کی زندگی اور اسلام میں واضح طور پر جو اچھائی اور نیکی پائی جاتی تھی۔ جب انہیں آپ کے پاک نمونہ اور نظریات کا سامنا کرنا پڑا تو کمزور اور نا قابل ثبوت حیلے بہانے ڈھونڈنے شروع کر دئے۔

رسول اکرم ﷺ پر بہتان لگانا مغربی مستشرقین کا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ ان بہتانوں میں سے ایک یہ ہے کہ اواخر عمر میں آپ ہوس پرست ہو گئے تھے۔ یہ ایک شر عظیم ہے جس پر ذرا بھی توجہ دئے بغیر فوراً مسترد کر دینا چاہئے۔ اس لئے کہ یہ آپ کی پاک زندگی اور نیک کردار کے سخت ناموافق ہے۔ اس دعویٰ کو مان لینا کہ تعدد ازدواج اعلیٰ درجہ کی روحانیت کی نفی ہے ہرگز کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ یاد رہے کہ تمام بڑے بڑے مذاہب کی الہامی کتب میں تعدد ازدواج کو ممنوع نہیں قرار دیا گیا۔ تمام یہودی انبیاء کی، بشمول حضرت موسیٰ علیہ السلام کے، متعدد ازواج تھیں۔ ان انبیاء میں سے کسی ایک نے بھی یہ دلیل کبھی پیش نہیں کی کہ اس وجہ سے وہ صالح زندگی نہیں گزار

سکتے تھے۔

یہ موضوع شرارت پسندوں کیلئے مضحکہ خیز اور اُکسانے والا بن کر رہ گیا ہے۔ مغربی مستشرقین جنہوں نے اس موضوع کو اچھالا اور تمام دنیا کے سامنے اس کا ڈھنڈورا پیٹا۔ ایسے ویسٹرن سکالرز جنہوں نے معقول اور منطقی غور وفکر کے بعد نیک خیالات کا اظہار کیا لیکن ان کو کلیتًا عوام کے سامنے پیش نہ کیا کہ اب کوئی ان کتب کی طرف توجہ بھی نہیں دیتا۔ مثال کے طور پر پروفیسر لوراویشیا وگلیری (Prof. Laura Veccia Vaglieri) جو یونیورسٹی آف نیپلز میں عربی اوراسلامک کلچر کی تدریس کا کام کرتی تھیں، اس نے درج ذیل خیالات کا اظہار کیا ہے:

"اعداء اسلام نے محمد کو ایک ہوس پرست انسان اور بدچلن شخص کے طور پر پیش کر کے ان کی ازدواجی زندگی میں کمزور پہلو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے جو ان کے مشن سے مطابقت نہ رکھتا تھا۔ وہ اس حقیقت پر غور کرنے سے انکار کرتے ہیں کہ زندگی کے اس دور میں جب انسان کے اندر شہوانی قوت بہت زیادہ ہوتی ہے، اگر چہ وہ اس وقت عرب لوگوں کے معاشرہ میں رہتا تھا جہاں تعدد ازدواج کا قانون چلتا تھا جہاں طلاق دینا بہت آسان تھا وہ صرف ایک عورت سے بیاہا ہوا تھا یعنی خدیجہ سے جو ان سے عمر میں کافی بڑی تھی اور یہ کہ پچیس سال تک وہ خدیجہ سے پیار کرنے والا وفادار شوہر رہا۔ صرف اس وقت جب اس (خدیجہ) کی وفات ہوئی اور وہ خود عمر میں پچاس سال سے زیادہ تھا تب اس نے ایک سے زیادہ مرتبہ شادی کی۔ ان شادیوں میں سے ہر ایک شادی کا کوئی نہ کوئی معاشرتی یا سیاسی پہلو تھا...... ماسوا عائشہ کے اس نے ایسی عورتوں سے شادی کی جو نہ تو کنواری تھیں نہ ہی نوجوان اور نہ ہی خوبصورت۔ کیا اس چیز کا نام شہوت پرستی ہے؟

(*An Interpretation of Islam*, pp 67-68)

رسول اکرم ﷺ کی حضرت عائشہؓ سے شادی کرنے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ زندگی بھر لوگوں کی اسلامی طریق سے تربیت کرسکیں خاص طور پر عورتوں کی۔ حضرت عائشہؓ نے اس فرض کو غیر معمولی رنگ میں احسن طور پر سرانجام دیا۔ اور نہ صرف نبی پاک ﷺ کی زندگی میں بلکہ اس کے بعد بھی عرصہ دراز تک لوگوں کی رہ نمائی کا بہت بڑا ذریعہ ثابت ہوئیں۔ اس قسم کی تھی حضرت محمد (صلعم) کی دوراندیشی۔

سر محمد ظفر اللہ خاں جو مذاہب عالم کے ایک بلند پایہ احمدی عالم تھے انہوں نے رسول اکرم ﷺ کے کردار کی شرافت کی متناسب منطقی دلیل اور آپ ﷺ کے کردار کی شرافت پر نظر غائر ڈالی ہے۔ انہوں نے اس طرح سے ان بہتانوں سے شکوک کو رفع کیا ہے جو اس خدا کی شریف ترین مخلوق پر لگائے گئے۔ انہوں نے اپنی مشہور کتاب 'محمد خاتم النبیین' میں آنحضور ﷺ کی زندگی کا بہترین جائزہ پیش کرتے ہوئے درج ذیل دلیل پیش کی ہے:

"ماسوائے حضرت سودہؓ کے ساتھ آپ کی شادی کے، جو ایک نیک، معمر، غریب بیوہ تھیں جن کی شادی کے بعد کی تمام ہونے والی شادیاں مدینہ میں ہجرت کے بعد عمل میں آئیں۔ مدینہ میں آپ کس قدر مصروف کار تھے اور کس قسم کی زندگی بسر کر رہے تھے؟ ایک عام قاری بھی...... آپ کی بھاری ذمہ داریوں سے گہرے طور پر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آپ کا اپنی ذمہ داریوں کو محنت کے ساتھ نبھانا، آپ کا متبعین کو اپنے مذہب کی تعلیمات سکھلانا، غیر معمولی مصروفیت کے ساتھ ان کی روحانیت اور اخلاق کی پند و نصیحت کے ذریعہ مدد کرنا، روزانہ پانچ وقت کی نمازوں کی امامت کرنا، مدینہ کی مختلف النوع آبادی کے معاملات کے نظم و نسق کو چلانا، رات کے بیشتر حصہ میں نفلی نمازیں ادا کرنا، ان سب کا سوچ کر خیال آتا ہے کہ آپ اپنی بیویوں کی صحبت میں بھلا کتنا وقت گزارتے ہوں گے، آپ اپنے وقت کا اور کیا مصرف نکالتے ہوں گے،...... نبی کریم ﷺ کی زندگی صرف سادہ زندگی کا ہی نمونہ نہ تھی بلکہ ایک سخت زہد کی بھی۔ انہوں نے کسی قسم کی بے اعتدالی کی اجازت نہ دی۔ نہ ہی اپنے آپ کو اور نہ ہی اپنی بیویوں کو...... حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ ایک کنواری سے زیادہ حیادار تھے۔ کیا یہ ایسے شخص کی وضع قطع ہوگی جو شہوانی خواہشات میں ڈوبا ہوا ہو۔ اور کئی عورتوں سے شادی کر کے جنسی خواہشات کی تشفی کے لئے ہر موقعہ کی تلاش میں رہتا ہو"

(Zafrulla Khan, *Muhammad - Seal of the Prophets*, page 280)

قرآن پاک پر حملے

میکسم روڈنسن نے قرآن پاک کی عصمت و پاکیزگی کے متعلق شکوک پیدا کر کے اسلام پر حملوں کو جاری رکھا ہے۔ وہ یورپین مستشرقین کی کتب کو مسلمان مفسرین (قرآن) کی کتب پر ترجیح

دیتا ہے۔ وہ عبرانی کے جرمن سکالر تھیوڈور نولڈک (Theodore Noldeke) کا سرگرم پیروکار نظر آتا ہے "جس نے قرآن پاک کے سٹائیل کی خامیوں پر تفصیل کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے" (صفحہ 93)۔اس نے مزید مطلب نکالا کہ قرآن پر رسول پاک (صلعم) کی ہدایت پر نظر ثانی کی گئی تھی اور عیسائی عقلیت پسندوں کے نقطہ نظر کو پیش کرتا ہے کہ "محمد کذب و افتراء کے قصوروار تھے انہوں نے دیدہ ودانستہ اپنے خیالات اور نظریات کو اللہ کے نام سے منسوب کر دیا" (صفحہ 218) اور یہ کہ انہوں نے "راستی کو کھینچ تان دیا"۔(صفحہ 78)

یہ چیز مزعومہ طور پر بعض آیات میں شیطانی اثرات کا موجب بن گئی، جیسا کہ روڈنسن لکھتا ہے: "غیر مسلموں کو صاف نظر آجاتا ہے کہ محمد نے جو الفاظ سنے تھے اور جو ان پر ہو بیتی (جس کا اظہار الفاظ میں بالکل ناممکن تھا) وہ کس طرح معجزانہ طور پر صحیح الفاظ کے روپ میں ڈھل گئے۔ شاید وہ الفاظ ان کو ان کے نیم شعور نے لکھوائے تھے۔اس پر ان کو خود بھی شک تھا بلکہ انہوں نے ان کے منبع پر شک کا اظہار کیا تھا۔وہ اس وسوسہ سے لاحق تھا کہ انسانی وجدان نے شاید اس کا کچھ حصہ لکھا تھا اور جیسا کہ ہم نے دیکھا انہوں نے بعد میں ایک مرحلہ پر اس امر کا اعتراف کیا کہ اس میں شیطان اپنی ہدایات واحکامات شامل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا"۔(صفحہ 219)

روڈنسن نے اعتراف کیا ہے کہ اس نے اپنی کتاب میں محمد (صلعم) کا جائزہ خالصتاً ایک غیر جانبدارانہ نقطہ نظر سے پیش کیا ہے لیکن کتاب لکھنے کی وجوہات کتاب کے پیش لفظ اور تتمہ میں ظاہر ہوگئی ہیں۔پیش لفظ میں وہ کتاب لکھنے کا ایک قسم کا جواز پیش کرتا ہے جبکہ ایسی کئی کتب اس سے پہلے محمد ﷺ کے بارہ میں لکھی جا چکی ہیں، خصوصاً حال ہی میں لکھی جانے والی۔ یقیناً وجہ یہ ہے کہ اسلام پر مستقل اور مسلسل یلغار نے دوام کا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ان یلغاروں نے کسی نہ کسی رنگ میں جاری رہنا تھا، اس سے زیادہ اچھا طریقہ کیا ہوسکتا ہے کہ اسلام کے نبی پاک ﷺ کے نقائص بیان کئے جائیں اور من مرضی سے انہیں جو چاہیں بنالیں، اور انہیں صرف اصلی روشنی سے کم روشنی میں ہی نہیں پیش کریں بلکہ انہیں گستاخ اور حقارت آمیز زبان میں بیان کیا جائے۔

کتاب کے اختتام کے قریب وہ پاؤں جما کر اپنی اصل خصلت کو ظاہر کرتا ہے جب وہ آنحضور ﷺ کے کردار کا خلاصہ پیش کرتا ہے۔حضرت مرزا غلام احمد مسیح موعود علیہ السلام نے اپنی

کتاب ''فتح اسلام'' میں مغربی سکالرز کے تعصب کے متعلق مسلمانوں کو قبل از وقت یہ کہہ کر متنبہ کردیا تھا کہ مغربی اقوام فریب کاری اور دھوکہ بازی کے ذرائع کو استعمال میں لاکر اپنے جھوٹوں اور جعلسازیوں سے عوام کو گمراہ کریں گی۔ روڈنسن نے آخری دو پیراگراف میں رسول اکرم ﷺ کی زندگی کا خاکہ بیان کرتے ہوئے جو زبان استعمال کی ہے، اس کے ذومعنی الفاظ پر ذرا غور کریں:

"تصویر چنداں سادہ نہیں ہے، یہ کوئی شیطانی عجیب الخلقت چیز بھی نہیں......نہ ہی سرد خون والا جعلساز، نہ ہی سیاسی نظریہ پیش کرنے والا اور نہ ہی عارف جو کلیتاً خدا سے لو لگاتا ہو۔ اگر ہم نے اسکو درست طریق سے پہچان لیا ہے تو محمد ایک پیچیدہ انسان تھا، تضادات سے بھرپور۔ وہ عیاشیوں کا رسیا تھا لیکن زہد واتقاء میں ڈوبا ہوا۔ وہ اکثر رحمدل لیکن بعض دفعہ ظالم بھی تھا......بعض دفعہ وہ نرم مزاج اور کبھی نروس ہوتا تھا۔ بہادر اور بزدل، فریب اور صاف گوئی کا امتزاج، درگذر کرنے والا اور بیک وقت زبردست کینہ پروری کا حامل، فخر کرنیوالا اور عاجزی کا سراپا، پاکباز اور شہوانی خواہشوں کا مالک، ذہین اور بعض معاملات میں بے وقوف اور غبی انسان تھا"۔(صفحہ 313)

مستشرقین کا جنتر منتر کھل کر سامنے آ گیا ہے اور یہی وہ طلسم ہے جس نے محمد (صلعم) میں مزعومہ نقائص کو نمایاں کیا ہے جو مفروضہ طور پر شیطانی اثر و رسوخ ان کے ذہن میں داخل کرنیکا ذمہ دار ہے، جسطرح وہ ایک عام بشر کے ذہن میں داخل کرتے ہیں۔ یہ میکسم روڈنسن کا یکطرفہ فیصلہ ہے اور اس کے اختتامی پیراگراف میں اس نے جو مطلب نکالا ہے وہ بھی انتہائی جھوٹی فروتنی مگر اپنی بڑائی کے الفاظ میں ختم ہوتا ہے:

" کیا ہمیں ان پیچیدگیوں اور تضادوں پر تعجب کا اظہار کرنا چاہئے؟ یہ جو خوبیوں اور خامیوں کا امتزاج تھا۔ وہ بہرحال دوسرے انسانوں کی طرح محض انسان تھا انہی بشری خامیوں کے زیر بار اور اسی قسم کی صلاحتیوں کا مالک، محمد ابن عبداللہ، قریش کے قبیلہ کا، ہمارا بھائی"۔(صفحہ 313)

واہ بلاشبہ کیسا بھائی ہے، جس شخص کو میکسم روڈنسن جیسا بھائی مل جائے اسے کسی دشمن کی کیا ضرورت ہے؟

ڈاکٹر نارمن ڈینیئل (Dr Norman Daniel)

ڈاکٹر نارمن ڈینیئل دوسری جنگ عظیم سے قبل کوئینز کالج آکسفورڈ کا عالم وفاضل تھا اور بعد میں ایک عظیم مغربی مستشرق ولیم منٹگمری واٹ کا جنگ کے بعد چیلہ بن گیا۔ پروفیسر واٹ اس کے پی ایچ ڈی کے مقالہ کا نگران تھا۔ واٹ جیسے نگران کے تحت کام کر کے یہ تعجب نہیں تھا کہ ڈاکٹر ڈینیئل کی بعد میں شائع ہونے والی کتب واٹ کی مضحکہ خیز نقل ہوں جو اس نے مسلم عیسائی مناظروں میں ادبی مضامین کے بطور لکھیں۔

ڈاکٹر ڈینیئل کی سب سے مشہور کاوش مغربی مستشرقین کے قائم کردہ عنوان کے مطابق تھی کہ یورپین ذہنوں میں اسلام کا مسخ شدہ تصور کیوں پیدا ہوا؟ اس چیز کو عیسائی معاشرہ نے اپنا عقیدہ بنا لیا اور یہی وہ سب کچھ ہے جس کی ڈاکٹر ڈینیئل نے خاکہ کشی کی ہے۔ لیکن جلد ہی یہ امر واضح ہو گیا کہ طریقہ واردات تو ایک ہی ہے، دلائل بھی ایک جیسے ہیں، مواد کے محدود ماخذ بھی ایک ہی ہیں اور مشکوک مقاصد جو نمایاں ہوئے وہ بھی ایک جیسے ہیں۔ ڈاکٹر ڈے نیل کی اس تصنیف کا نام ہے: *Islam & the West - The Making of an Image*, 1960. اس کتاب میں ڈاکٹر ڈینیئل نے اسلام کے بارہ میں اڑھائی سو سال کے عرصہ 1100-1350ء کے دوران مغربی نظریات کی تشکیل کا جائزہ پیش کیا ہے۔

اسلام کا تصور (1100-1350ء)

ڈاکٹر ڈینیئل مذکورہ عرصہ کے دوران اسلام کے خلاف عوام میں مقبول اور مسخ شدہ تصور کا حوالہ پیش کر کے کتاب کو شروع کرتا ہے۔ مثلاً قرآن پاک کے خالص اور منجانب اللہ ہونے کے بارہ میں شکوک کا اظہار کیا گیا کہ یہ خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ کتاب ہے نیز اُن روایات کے بارہ میں بھی جن کا ذکر احادیث میں پایا جاتا ہے۔ مزید برآں سرور کائنات ﷺ کے کردار کے پاک وصاف ہونے کے بارہ میں شکوک پیدا کئے گئے۔ بارھویں اور چودھویں صدی کے درمیانی عرصہ میں یہ عام ہوا چل نکلی تھی کہ نبوت کا کوئی ٹیسٹ ہونا چاہئے۔ اس کا معیار قائم کرنے کیلئے پیمانہ بنالیا گیا جس کے مطابق انبیاء کرام پر فیصلہ اس معیار کے مطابق صادر کیا جانے لگا۔ اگر بالفرض عیسائی مناظر

یہ ظاہر کرسکیں کہ محمد (صلعم) نبی نہیں تھے تو پھر اسلام کا سارا تانا بانا ٹوٹ گیا۔ ڈاکٹر ڈینیئل مزید کہتا ہے کہ اس مفروضہ کا الٹ بھی صحیح متصور ہوگا۔ بہ الفاظ دیگر اگر عیسائی مناظر یہ ثابت کرسکیں کہ محمد (صلعم) ایک سچے اور صادق نبی تھے تب اسلام نصرانیت کیلئے حقیقی خطرہ ثابت ہو جائیگا۔ پس لازمی تھا کہ محمد (صلعم) کو سچا نہ ثابت ہوسکنے کیلئے ان میں نقائص نکالے جائیں۔ یہ ثبوت کہ "محمد نے نبی کا لقب جھوٹے طور پر اختیار کیا اس کی واشگاف وضاحت کرنی ضروری تھی"۔ (صفحہ 67)

تو یہ کام عیسائی مصنفین کا مرہون منت ہوا۔ ڈاکٹر ڈینیئل، پیٹر دی وینیریبل (Peter the Venerable) کا حوالہ اور خاص کر پیڈرو ڈی الفانسو (Pedro de Alfonso) اور پیٹر آف پائیٹیر (Peter of Poitier) کے حوالہ جات دیتا ہے جن کی مجموعی اسکیموں کا خلاصہ یہ ہے کہ "محمد نبی ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ وہ تو ایک لٹیرا، قاتل، دغاباز اور زناکار تھا" نیز یہ کہ قرآن کریم کی تعلیمات "جو شرمناک اور متضاد ہیں انکی تصدیق معجزات سے نہیں ہوسکتی"۔ (صفحہ 68)

ڈاکٹر ڈینیئل مزید کہتا ہے: "اسلام میں جو وحی کے نزول کا دعویٰ پایا جاتا ہے محمد کی زندگی اس کو غلط ثابت کرتی ہے اور اس کو سب سے منفی ترین ثبوت سمجھا گیا۔ اس مقصد کیلئے مصنفین نے تسلیم کرلیا اور یہ ظاہر کرنے کی خواہش کی کہ محمد نچلے طبقہ میں پیدا ہوا اور شروع ہی سے بت پرست تھا جس نے ریشہ دوانی سے طاقت پر قبضہ کرلیا اور مزعومہ الہامات کا بہانہ تراش کر اپنی طاقت کو قائم ودائم رکھا۔ جس نے اپنی طاقت کو تشدد کے وسیلہ سے پھیلایا اور اسے وسعت دینے کیلئے دوسروں کو شہوت پرستی کی اجازت دی جس کا وہ خود بھی عادی تھا۔" (صفحہ 79)

مغربی مستشرقین کی کتب کے حوالہ سے ڈاکٹر ڈینیئل نے اسلام کے بگڑے ہوئے تصوّر کی خاکہ کشی کی جو کوششیں کی ہیں وہ بجا مگر وہ خود عیسائی چرچ کے عقائد کا شکار بن گیا۔ اور یہ واضح طور پر تب سامنے آتا ہے جب وہ اپنی تحریروں میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ محمد کے خلاف اتہامات میں کچھ تو صداقت ہونی چاہئے کیونکہ ہر کوئی اس امر کی طرف اشارے کنائے کر رہا ہے۔ "محمد کی سوانح کے جو واقعات قلم بند کئے گئے ہیں ان کا حقیقت سے جو تعلق ہے، افسانوی واقعات کے قطع نظر جو کچھ کہا گیا ان میں دو موضوع پے در پے ابھرتے ہیں۔ محمد تشدد پسند تھا، اس نے جنگ دوسروں پر تھوپی اور لوٹ مار کیلئے بے احتیاطی سے قتلوں کے جو احکامات صادر کئے وہ ذاتی اغراض

کیلئے تھے۔امر ثانی یہ ہے کہ اس پر انسانی کمزوریاں غالب آسکتی تھیں، اسے زوال وعروج سے گزرنا پڑا۔عام زندگی میں قسمت کا اتار چڑھاؤ اس کی تاریخ ظاہر کرتی ہے"(صفحہ 96)

ڈینئل بھی گزشتہ مستشرقین کے گھسے پٹے راستوں پر گامزن ہے جس طرح وہ محمد (صلعم) کے کردار پر شہوت پرستی کا الزام عائد کرتا ہے۔اس مقصد کے لئے متعدد صفحات ضائع کر دئے گئے لیکن میں صرف ایک ہی حوالہ دیتا ہوں جس کا بیان تکلیف دہ ہے۔لیکن اس مثال سے قاری کو مصنف کے بدارادوں اور کینہ پروری کا اندازہ ہو جائیگا:"شاید عہد وسطیٰ کی مقبول ترین کہانی محمد کی زینب بنت جحش سے شادی زید بن حارثہ سے طلاق ہونے کے بعد کی ہے۔یہ کہانی اپنے اندر پولیس کی چوکی کے کردار کی مقبول عام فریاد رکھتی ہے......یعنی منہ بولے بیٹے کی بیوی کے ساتھ قریب قریب زنا، محمد نے جب خود کو انسانی جسم کی حرص کی مدافعت کے قابل نہ پایا تو خصوصی وحی کو اپنے لئے بطور جواز کے استعمال کیا۔"(صفحہ 97)

اس دور کے عیسائی مناظرین کے ان تمام الزامات اور دعاوی کیساتھ، عہد وسطیٰ کے عیسائیوں نے یہ نتیجہ اخذ کرلیا کہ محمد کے عورتوں کے ساتھ (مزعومہ) برے سلوک نے یہ ناممکن بنا دیا کہ وہ نبی بننے کا حقدار تھا۔

آنحضور ﷺ کی وفات

رسول کریم ﷺ کی وفات کے موضوع پر مختلف النوع اور نا قابل یقین کہانیاں گھڑ لی گئی تھیں۔سوانح نگاروں کے نزدیک اولیاء کی اموات ایک خاص اہمیت کی حامل ہوتی تھیں اور عہد وسطیٰ کی روایات کے مطابق محمد (صلعم) کی وفات، جو کہ ولی کے متناقض ہے، کو بھی مذہبی اہمیت کا حامل سمجھا گیا۔اسے ایسے طور پر پیش کیا گیا جیسے یہ بے رحمی کی وحشتناک موت تھی۔بعض دفعہ ایسے گویا ایک عام انسان کی موت جس پر خدا کی خاص رحمت کے نشانات ظاہر نہ ہوئے ہوں۔

ان افتراؤں میں سے بعض کا بیان بہت دردناک ہے۔اور ان کا کسی قسم کی زیادتی یا کم تفصیل سے کسی پڑھنے والے کو سزا دینا بے حرمتی کا مصداق ہوگا۔اگر کسی کو نبی کریم ﷺ کے وصال کی جو جھوٹی کہانیاں گھڑ لی گئیں ان کی تفصیل میں جانے کی خواہش ہے تو اسے چاہیئے کہ وہ

ڈاکٹر ڈینیئل کی کتاب کے متعلقہ حصوں (صفحات 107-102) کا مطالعہ کرلے۔

ڈاکٹر ڈینیئل جب بعض کہانیوں پر اندھا دھند اعتماد کر لیتا ہے تو اس کی منافقت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ نبی کریم ﷺ کی موت کو موجب ذلت کہنے کا بڑا مقصد یہ تھا کہ ان پر غیر مقدس صفات کا سیاہ دھبہ لگایا جاسکے۔ جیسا کہ ڈاکٹر ڈینیئل لکھتا ہے: "جس طرح اچھی موت نیک ہستی کی نشانی ہوتی ہے اس کے مطابق (اسلام کے) پیغمبر کو کماحقہ موت آئی، کماحقہ اس رنگ میں کہ وہ وحشتناک موت تھی اور یقیناً یوں اس لئے ہوا تا اس کے غیر مقدس ہونے پر مہر ثبت ہوجائے"۔ (صفحہ 106)

نفس پروری

نفس پروری کا جو الزام عائد کیا جاتا ہے اس رخ سے اسلام پر حملے جاری رکھے گئے۔ ماضی اور آجکل کے مغربی قاری کیلئے یہ موضوع خاصی دلچسپی کا باعث ہے اتنا کہ ان پر خبط سوار ہو جاتا ہے۔ جہاں تک جنس کے بارہ میں اخلاق کا تعلق تھا ڈاکٹر ڈینیئل کہتا ہے: "یہ محسوس کیا گیا کہ یہ موضوع دنیائے عیسائیت کی بہبودی کے لئے جس قدر بنیادی تھا اتنا ہی لوگوں کے تخیل کو بھڑکانے والا بھی تھا۔ مسلمانوں کی اخلاقی قیود سے مزعومہ آزادی پر عیسائیوں نے جو تنقید کی اور مبالغہ سے کام لیا اس میں انہوں نے زیادتی کا پہلو اختیار کیا تھا"۔ (صفحہ 135)

ڈاکٹر ڈینیئل مستشرقین کے حقیقی عزائم کا اعتراف کرتا اور ان مزعومہ حقائق کے مآخذ کا بھی جن کا حوالہ اکثر دیا جاتا ہے۔ ان کا منبع بھی ایک ہی مکتب خیال اور علمی تحقیق ہوتا ہے۔" کم وبیش تمام مصنفین کا یہ رجحان رہا ہے کہ وہ اسلام اور اسکے پیغمبر کے بارہ میں خودفرضی کہانیوں کو گلے لگائے رکھیں جیسے وہ ان کی ذاتی ملکیت ہوں۔ اور اس طرح کہ وہ عیسائی تصور کے مطابق ہوں...... وہ "حقائق" جن سے اسلام کا جھوٹا ہونا ثابت ہو ان کو سب دوسرے حقائق پر ترجیح دی جاتی تھی...... مشہور عالمانہ اور مقبول عام کتب میں یہی مناظرانہ خاکہ مشترک ہے۔ ان کے مقاصد میں نامکمل یگانگت اور اعداد وشمار کے استعمال میں اسی قسم کا انداز پایا جاتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ کن حدود کے اندر رہ کر ایسے کیا گیا۔ جو زیادہ ناقابل یقین تھا اسے مسترد کر دیا جو زیادہ معتبر تھا

اسے قبول کر لیا ایک صورت میں نہیں تو اگلی میں سہی۔ اسلام پر حملے کرنے میں جھوٹی گواہی کا استعمال آفاقی صورت اختیار کر چکا تھا۔" (صفحہ 241-240)

ڈاکٹر ڈینئیل اپنے ہم عصروں کی طرح بلاخوف تردید 'غلط بیانی' اور عیسائیوں کے اصل خوف کی وجہ بیان کرتا جو یہ ہے کہ اسلام نے اہل مغرب کو اپیل کرنا شروع کر دیا تھا: "عہد وسطیٰ بھی دوسرے ادوار کی طرح تھا جس میں تاریخی حقائق اور مخالفوں کے نظریات کو از سر نو ترتیب دیا گیا تا کہ بلند و بانگ مقصد کیلئے مناسب ثابت ہوں۔ یہ بیان کرنا اہم ہے کہ حقائق اور اسلامی عقائد کی یوں دوبارہ ترتیب دی گئی کہ اس سے ان کی تردید ہوتی تھی اور ان کا مقصد بھی عیسائیوں کے لئے تردید ہی تھا۔ درحقیقت اسلام کو کبھی اسطرح پیش نہیں کیا گیا کہ وہ مسلمانوں کیلئے نفرت انگیز ہو۔ اس میں کیا شک ہے کہ اسقدر مواد تو تھا ہی جس سے مسلمانوں میں نفرت پیدا ہو جائے۔ لیکن اسلام کا جو ناخوشگوار عکس عیسائیوں نے تیار کیا وہ عیسائی آنکھوں کو ناخوشگوار بنانے کیلئے بنایا گیا تھا...... کسی نہ کسی طرح اسلام کو غیر مؤثّر بنا دیا گیا یا غیر مشابہ یا پھر واقعی تمام اہم عیسائی تعلیمات سے متناقض"۔ (صفحات 265-264)

اسلام کے کٹر مخالفین جو ڈاکٹر ڈینئیل کی طرح کے ہیں وہ اوپر بیان کردہ حقائق سے ہرگز انکار نہیں کر سکتے۔ اس کو کئی بار اسلام سے عیسائیت کو خطرہ اور حسد کا اعتراف کرنا پڑا۔ اس کے فوراً بعد ایک مثال پیش کی گئی: "اسلام ابھی تک جنگی محاذ پر تھا اس بناء پر بطور دشمن اس کا برملا اعتراف ضروری تھا اور اس رنگ میں پیش کیا جانا کہ اس سے عیسائی تہذیب کے کسی ایک جزو کو بھی بدلنا نہ پڑے......اہم بات یہ تھی کہ مغرب کیلئے موزوں اور یہ وقتی ضرورت کے مطابق تھا۔ اس طریق سے عیسائیوں کو ارتداد سے محفوظ رکھنا تھا۔ اس چیز سے دنیائے عیسائیت کو عزت نفس ملی تا اس تہذیب کا مقابلہ کر سکے جو اس سے بدرجہا بہتر تھی۔" (صفحہ 270)

جبر والی مورتی

اسلام کے بارہ میں سب سے زیادہ مقبول عام فرضی کہانی جو تخلیق کی گئی وہ یہ تھی کہ اسلام کس طرح پھیلا؟ نیز یہ دعویٰ کہ اسلام طاقت کے بل بوتے پر پھیلا جس کے لئے تلوار استعمال کی

گئی۔قرآن پاک کی برتر اور ہمدردی والی تعلیم جس کی عملی تفسیر نبی پاک (صلعم) نے فرمائی اس کو درخوراعتناءنہیں جانا جاتا۔ یہ تبدیلی دین بزورجبر کی تصویر دیدہ ودانستہ طور پر کھینچی گئی تاکہ عیسائیت سے نکل کر اسلام قبول کرنے والوں کی رفتار کی روک تھام کی جا سکے۔لیکن یہ تصویر اس دور میں لفظاً ایک خاکہ کے طور پر پیش کی گئی تھی اور مغربی مستشرقین نے ہر موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے دنیا کے سامنے پیش کیا۔

گزشتہ کئی صدیوں سے لیکر زمانہ حال تک مسلمانوں کے دلوں میں ہمیشہ ہی سرور کائنات ﷺ کی ایسی عزت وتکریم رہی ہے کہ آپ کی ذات مبارک کی تصویر کشی یا خاکہ کشی ممنوع قرار دیدی گئی۔لیکن بعض مستشرقین نے بے حسی کا ثبوت دیتے ہوئے اس کے عین الٹ کیا۔ڈاکٹر ڈینئیل کا بھی اس زمرہ کے بے حس مصنفین میں شمار ہوتا ہے۔اس نے کہیں سے اس قسم کی تصویر تلاش کر کے اپنی کتاب میں شامل کی ہے۔تصویر کے ساتھ جو نوٹ لکھا گیا ہے وہ بھی سنگدلانہ ہے۔ڈینئیل نے اسے "سیاہی سے تیارہ شدہ محمد کا خاکہ کا نام دیا جو عہد وسطیٰ کے ایک مسودہ سے لیا گیا جس میں وہ اکیلا پڑا نظر آتا ہے۔اس کا مقصد بظاہر کسی اصل عبارت کی وضاحت کرنا نہ تھا"۔ (صفحہ 134)

اس خاکہ میں محمد (صلعم) کی تصویر اس طور سے دی گئی ہے کہ دائیں ہاتھ میں تلوار ہے۔ تلوار کے ایک کونے سے لیکر دوسرے کونے تک یہ الفاظ کندہ ہیں:

"gladius Mahumeti pictus"

بائیں ہاتھ میں قرآن ہے جس کی جلد پر لکھا ہے "lex et alcoranus"۔اسلام کی یہ وہ خیالی تصویر ہے جسے دشمنان اسلام نے پیش کیا ہے۔حضور نبی پاک ﷺ کے گلے میں تعویذ لٹک رہے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ قسمت کا حال بتانے والے، شیطان کو نکالنے والے، ایک ایسے شخص تھے جو اپنے جادو سے لوگوں کو مسحور کر کے ان سے مذہب تبدیل کروالیتا تھا۔

گویا یہ کافی نہ تھا۔ڈاکٹر ڈینئیل کی گستاخی اور دیدہ دلیری ملاحظہ کیجئے جب وہ تجویز کرتا ہے کہ اس قسم کا برتاؤ 'عزت افزاء' ہے۔ایسا سوچ کر انسان کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں کہ اگر محمد ﷺ کی عزت افزائی والی تصویر کشی اس نوعیت کی ہے تو پھر اگر ہتک آمیز تصویر کشی کی جائے تو اس کا کیا نتیجہ ہوگا؟

مستشرقین میں مماثلت

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مستشرقین کی مذہب اسلام اور خصوصاً محمد ﷺ کی زندگی کے مطالعہ کی اصل غرض ان کی مسخ شدہ تصویر پیش کرنا تھا جس کا پتہ آسانی سے چل جاتا ہے۔ تقریباً تمام مصنفین نے گٹھ جوڑ کر لیا ہے کہ وہ ایک ہی نوع کے محدود ماخذوں کا استعمال کریں جن کو وہ پہلے ہی بار بار استعمال کر چکے ہیں۔ وہ کسی گھسے پٹے پرانے ریکارڈ کی طرح سنائی دینے لگے ہیں۔ انہوں نے محمد (صلعم) کی زندگی کا پس منظر پیش کیا: جزیرہ نما عرب جہاں آپؐ کی پیدائش ہوئی، آپؐ کی ابتدائی زندگی، آپؐ کا نبوت کیلئے انتخاب اور آپ کے حالات بوقت وفات یہ سب اس طور سے پیش کئے گئے کہ آپ محض ایک انسان تھے جس سے غلطی سرزد ہوسکتی تھی اور آپ پر رسوا کرنے والی بدقسمتی وارد ہوسکتی تھی۔ (فی الحقیقت یہ بعینہٖ وہی طریقہ واردات ہے جسے سلمان رشدی نے اپنے رسوائے زمانہ ناول میں استعمال کیا ہے۔)

مستشرقین کی مدتوں سے یہ عادت چلی آ رہی تھی کہ وہ ایک ہی قسم کے موضوعات پر گزشتہ مؤقر مصنفین کے حوالہ جات دیتے تھے۔ ان کے مآخذ بہت محدود ہوتے تھے۔ جیسا کہ خود ڈاکٹر ڈینیئل نے فرانسیسی مستشرق ری لینڈ (Reland) کی کتاب 'De Relgione Mohammedica' سے حوالہ دیا ہے: "اگر کبھی کوئی مذہب دشمن کے ہاتھوں بگاڑ کر پیش کیا گیا ہے تو یہ مذہب اسلام تھا۔ یہ رواج تھا کہ جس نوجوان میں محمدی مذہب کے جاننے کا جوش اور جذبہ پیدا ہوتا اسے بشمول کیتان (Ketton) پرانے صائب الرائے لوگوں کے پاس بھیج دیا جاتا تھا بجائے اسکے کہ اسے یہ مشورہ دیا جائے کہ عربی زبان سیکھے تاکہ محمد کی باتیں اس کی زبان میں سن سکے۔" (صفحہ 295)

ری لینڈ نے یہ اصول قائم کیا کہ اسلام کے بارہ میں حقائق کی واحد سند صرف مسلمان ہی کو حاصل ہوگی۔ اور یہی دلیل نصف صدی قبل ایڈورڈ پوکاک سینئیر (Edward Pocock Sr) نے بھی دی تھی۔ ڈاکٹر ڈینیئل کہتا ہے کہ اسلام پر اکثر علمی حملے جو قرون وسطیٰ میں ہونا شروع ہوئے وہ نہایت پائیدار ثابت ہوئے اور ان کا آجکل کی مغربی سوچ پر گہرا اثر ہے۔

"اسلام کے تقریباً چودہ صدیوں کے عرصہ میں عیسائیوں نے تثلیث اور مجسم خدا میں اعتقاد کو مسلمانوں کے حملوں سے محفوظ رکھنے کی سعی کی ہے۔انہوں نے جواباً اسلام پر حملہ کرنا شروع کر دیا کہ محمد یہ دعویٰ کہ وہ وحی کے نزول کا وسیلہ ہے اس کو ماننے سے انکار کر دیا جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس کے کردار نے ایسا ہونا ناممکن بنا دیا۔آخر کار انہیں صداقت اور غلطی کی آمیزش میں فیصلہ کرنا تھا۔اس کی قدر و قیمت کا کیسے اندازہ لگایا جائے؟ کسطرح غلطی کا جائزہ لیا جائے؟ اور ہر ایک کی اہمیت کو کیسے متوازن کیا جائے؟ آخری نتیجہ کا کیسے جائزہ لیا جائے؟ ان نکات کے بارہ میں عہد وسطیٰ کا نظریہ حد درجہ پائیدار نکلا اور اس کا یہ خاکہ آج تک اہل مغرب کے ثقافتی ورثہ کا حصہ ہے۔" (صفحہ 275)

پروفیسر ولیم منٹگمری واٹ

بلا شبہ دور جدید کے تمام مغربی مستشرقین میں سے مشہور ترین مستشرق منٹگمری واٹ ہے۔ یونیورسٹی آف ایڈنبرا (سکاٹ لینڈ) کا سابق پروفیسر عربی اور اسلامیات۔اسے مستشرقین کا آخری دیوتا قرار دیا جاتا ہے۔اس نے اسلام اور رسول کریم ﷺ کے بارہ میں کئی کتابیں تصنیف کی ہیں بشمول *Muhammad at Mecca*, *Muhammad at Medina*, *Muslim-Christian Encounters*, *Islamic Fundamentalism & Modernity*.

پروفیسر واٹ مغرب کی اسلام کے خلاف جہد و جہد میں ان کے اسلحہ خانہ کا قابل ذکر کل پرزہ بن چکا ہے۔دراصل وہ تمام دنیا میں مسلمانوں کیلئے تازیانہ بن چکا ہے۔اس کے کام اور ریسرچ کی تعریف کرتے ہوئے دوسرے تمام مستشرقین نے اسے سر آنکھوں پر بٹھایا ہے۔وہ اسے سب سے زیادہ خراج تحسین اس طرح پیش کرتے ہیں کہ جس فریب کاری سے اس نے اسلام کے ڈھانچہ میں شکوک اور نفرت کے بیج بوئے ہیں وہ اس کی نقل اپنی کتابوں میں کرتے ہیں۔انہوں نے بڑے مایوسی کے عالم میں نبی کریم ﷺ کے کردار پر نیز ان کے صحابہ کرام (رضوان اللہ) پر دھبے لگانے کی کوشش کی۔انہوں نے قرآن کریم میں اور حدیث کی روایات میں تضاد تلاش کرنے

کی کوشش کی ہے۔

منٹگمری واٹ نے جو کچھ لکھا ہے وہ اس سے پہلے مغربی سکالرز کے پیش کردہ مواد کے مقابلہ میں کچھ بھی نیا نہیں ہے۔لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس نے اسے کس طور پر پیش کیا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسا کہ حضرت مرزا غلام احمد صاحب مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا تھا:" بہکانے کے نئے نئے نسخے اور گمراہ کرنے کی جدید جدید صورتیں تراشی جاتی ہیں"(فتح اسلام صفحہ 3)۔

سر ہیملٹن گب (Sir Hamilton Gibb) نے ایک رسالہ ہبرٹ جرنل Hibbert Journal میں واٹ کی کتاب 'Mohammad at Mecca' پر غیر دانستہ طور پر نقد و نظر کرتے ہوئے کہا تھا:" یہ کتاب تاثر دیتی ہے کہ جیسے یہ کسی ایسے شخص نے لکھی ہے جو تخیل میں خود انہیں حالات سے گزر رہا ہو جن حالات سے محمدؐ کو مکہ میں دوچار ہونا پڑا۔اس جہت میں وہ گذشتہ سوانح نگاروں پر فوقیت لے گیا ہے۔"

یہی امر اس بنیادی مسئلہ کی وجہ اور فساد کی جڑ رہا ہے۔مستشرقین خصوصاً مغرب میں رہنے والوں نے اپنے تخیل کو بے لگام چھوڑ دیا ہے اور اپنے دلائل کی بنیاد شنید پر رکھی ہے۔انہوں نے حقائق کو اپنا مقصد حاصل کرنے کیلئے توڑ مروڑ دیا ہے۔حضرت محمد ﷺ کے کردار کو اسطرح تشکیل دیا ہے کہ وہ ان کے جذبات، طرز خیال اور مضحکہ خیز تصورات کے عین مطابق ہو۔

مثال کے طور پر میں بعض مخصوص فرضی صورتیں پیش کروں گا۔ واٹ نے اپنی کتاب Islamic Fundamentalism & Modernity میں اسلامی روایت کے مطابق قرآن کے بارہ میں شک کا اظہار کیا ہے کہ آیا یہ کلام الٰہی ہے؟ وہ "اس کی وحی میں انسانی عنصر کے شامل ہونے" کی بات کرتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ قاری دیکھ لے گا کہ اس دعویٰ کا کئی بار دوسرے مغربی سکالرز نے بھی اعادہ کیا ہے۔

واٹ قرآن پاک میں مذکور تاریخی حقائق کے بیان میں ''غلطیوں'' کی نشاندہی کرتا ہے جیسے:"مریم جو عیسیٰ کی والدہ تھیں، اس کو مریم جو ہارون کی بہن تھی"(28:19) کہہ کر بظاہر خلط ملط کر دیا گیا۔ دونوں کو عربی میں مریم کہا جاتا ہے۔اس سے اہم بات یہ ہے کہ عیسیٰ کو صلیب پر چڑھایا گیا اور وہ صلیب پر ہی فوت ہوئے (4:157) دونوں کا انکار کیا گیا ہے۔اور یہ دعویٰ کہ عیسائی تین

خداؤں کی پوجا کرتے ہیں۔(116 & 5:73 ,4:171) ...(صفحہ 83)

منٹگمری واٹ کی کوئی کتاب اس وقت تک مکمل خیال نہیں کی جا سکتی جب تک وہ عادت سے مجبور ہو کر سرور کائنات ﷺ کے کردار پر حملہ نہ کرلے۔ اور وہ کسی مغربی قاری کو مایوس نہیں کرتا جب وہ لکھتا ہے: "محمد کو کامل مثالی نمونہ بنا لینے، اور ابتدائی اسلامی سوسائٹی کی سچائی کے بارہ میں شک پایا جاتا ہے۔ لازماً محمد نے عالم جوانی میں اہل مکہ کے غیر اسلامی نظریات میں سے کچھ حصہ ضرور پایا ہوگا"۔(صفحہ 86)

حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو ایک ایسا شخص بنا کر پیش کیا گیا جو کڑے حالات میں اپنے وعدہ کا پاس نہ کرتا تھا۔ مثلاً 'محمد ایٹ مدینہ' کتاب میں واٹ لکھتا ہے:" یہ یقیناً مقدس مہینہ تھا جس میں خوں ریزی سے اجتناب ضروری تھا لیکن خود محمد نے مقدس ایام پر خصوصاً عمل نہ کیا" (صفحہ 47)۔ واٹ اپنی تمام کتب میں مسلسل اس بات پر زور دیتا ہے کہ محمدؐ جارح تھے۔ انہوں نے اپنے دین کو طاقت اور تلوار کے ذریعہ پھیلایا۔ وہ آگے جا کر اسی کتاب میں لکھتا ہے: "بعض اوقات محمد نے چست و چوبند آدمیوں کو اکسایا کہ وہ اپنے پڑوسیوں کے خلاف طاقت استعمال کریں۔ ان ہی میں سے ایک از دشانوعہ کے قبیلہ کا سراد بن عبداللہ تھا جو محمد کے پاس تقریباً بارہ افراد کے ساتھ آیا۔ محمد نے اسے ان آدمیوں پر لیڈر مقرر کر دیا...... اور انہیں کھلی چھٹی دے دی کہ اسلام کے نام پر اس علاقہ کے کسی بھی غیر مسلم سے خوں ریزی کریں۔ "(صفحہ 120)

گزشتہ چند دہائیوں میں واٹ یقیناً مغرب کا ایک باعزم عالم چلا آ رہا ہے اور ایک سے زیادہ ذرائع ابلاغ میں اظہار رائے کے مواقع میسر آئے ہیں جن سے وہ تھک چکا ہے۔ جیسا کہ وہ اپنی کتاب 'محمد ایٹ مدینہ' میں کھلے بندوں اعتراف کرتا ہے: میں نے محمد کے بارہ میں جو کچھ کہنا تھا وہ کہہ لیا ہے اگر میں اس سے زیادہ کہوں گا تو ممکن ہے کہ میں نے جو اچھا تاثر دینے کی کوشش کی ہے اس کے زائل ہونے کا احتمال پیدا ہو جائے۔ "

شاید ہمیں واٹ کی سرزنش پر ممنون ہونا چاہئے۔ اگر آج تک اس نے اپنی کتب لکھ کر حضرت محمد ﷺ کا اچھا تاثر قائم کرنیکی کوشش کی ہے تو میں یہ سوچ کر ہی کانپ جاتا ہوں کہ اگر وہ محمد ﷺ کے کردار کو آلودہ کرنے کا قصد کر لیتا تو کیسے بھیانک نتائج مرتب ہوتے۔

باب ہشتم

سکالرز کی نئی پود

مغرب میں عیسائی محققین کیلیئے منٹگمری واٹ کا متبادل تلاش کر لینا یقیناً ایک بہت مشکل امر رہا ہوگا، وہ ہر قسم کے راستوں اور امکانات کی تلاش میں سرگرداں رہے ہوں گے۔ انہوں نے ہندو پاکستان کی اقوام میں بھی محققین کی تلاش جاری رکھی۔ شاید یہ ان کا مستقبل کا منصوبہ تھا کہ ان قوموں کے اندر ہی سے چھپے غدار تلاش کریں اور رفتہ رفتہ مگر یقینی طور پر ان کی مغرب میں بے نقابی کی جائے۔

ڈاکٹر مائیکل نذیر علی

ان متبادل محققین میں سے سب سے پہلا ڈاکٹر مائیکل نذیر علی تھا، جو پاکستان کے لاہور کیتھیڈرل کا پرووسٹ رہ چکا تھا۔ اور جو برطانیہ میں پہلا ایشین ڈایوسیز کا بشپ (لاٹ پادری) بنا تھا۔ اس کو یہ اعزاز جنوری 1995ء میں دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر علی کی پیدائش پاکستان میں ہوئی، اس کا خاندان مسلمان تھا مگر اپنے باپ سمیت اوائل عمر میں ہی مذہب تبدیل کر کے عیسائی ہو گیا۔ اپنی نوجوانی سے اس نے اپنی عمر کا کثیر حصہ برطانیہ میں گزارا اس لئے وہ اہل مغرب کے لئے ایک مثالی آلہ کار نکلا جس کا استحصال ممکن تھا۔ اور اسکی ہمت افزائی کی گئی کہ وہ اسلام پر عیسائی نقطہ نگاہ سے طبع خیال کرے۔

ڈاکٹر علی نے اپنا اکثر مواد گذشتہ مستشرقین اور بعض آزاد خیال مسلمان محققین سے مستعار لیا ہے۔ لہٰذا اس نے جو کچھ پیش کیا وہ نہ تو نیا اور نہ ہی چونکا دینے والا تھا۔ اس نے پہلی کتاب جو 1980ء میں تحریر کی اس کا عنوان تھا: *Islam - A Christian Perspective* جس میں وہ عیسائیوں کے اس امر پر دلی حسد کو بیان کرتا ہے کہ محمد ﷺ کے متبعین دوسرے انبیاء بشمول حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں کسطرح آپ کی تعظیم وتکریم زیادہ کرتے ہیں۔ حسد تو کتاب

کے لفظ لفظ میں ٹپک رہا ہے۔اس کی دیدہ دلیری ملاحظہ ہو۔وہ تجویز کرتا ہے کہ عیسائیوں کا خدا اس خدا سے بہتر ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں ہوا ہے ۔ وہ کہتا ہے:" قرآن میں ہمیشہ متقیوں اور مومنوں سے خدا کے پیار کا ذکر ہوا ہے لیکن گناہ گاروں سے پیار کا کہیں بھی ذکر نہیں ۔ اس کے برعکس عہد نامہ جدید (انجیل) گناہ گاروں سے خدا کے پیار کا اکثر ذکر کرتا ہے۔"(صفحہ 62)

ملتے جلتے حملے

اس کے اس بودے دعویٰ کے جواز کی کوششیں دوسرے عیسائی سکالرز سے مختلف نہیں جنہوں نے آسانی کا راستہ یہ نکالا کہ اسلام کے نبی پاک ﷺ پر حملے بڑے بڑے افتراؤں اور کہانیوں نیز توڑی مروڑی ہوئی حکایات کے ذریعے کئے۔مثلاً ایک چھوٹے پیراگراف کی مختصر سی جگہ میں وہ محمد ﷺ پر کئی زمانوں سے کیا جانے والا پرانا الزام دہراتا ہے کہ وہ شہوت پرست اور ظالم تھے۔ڈاکٹر علی لکھتا ہے:" محمد کی زندگی کا سارا سانچہ سرتاپا عرب تھا۔اس کا کثرت ازدواج کرنا، اس کی داشتائیں، غربت کے ایام میں اس کا مال بردار قافلوں پر حملے کرنا، اس کا ناقابل بیان ظلم اور کے ساتھ اچانک جود و سخا کی طرف میلان ...... یہ تمام باتیں محمد کے کردار کی اتھاہ گہرائیوں میں رچی بسی ہوئیں تھیں۔(صفحہ 24)

ڈاکٹر مائیکل علی دیگر مغربی سکالروں سے اتفاق کرتا ہے اور شیطانی خیالات کو محمد ﷺ کی طرف منسوب کرتا ہے۔:" اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ پہلے تو اس نے لات، منات اور عزا کی دیویوں کو اپنے اور اللہ کے درمیان شفاعت کرنیوالا تسلیم کرلیا بعد میں اس نے کہہ دیا کہ یہ آیت شیطان نے دل میں ڈالی تھی اور اسے تبدیل کردیا۔"(صفحہ 25) مصنف نبی کریم ﷺ کے کردار کے خلاف مزید جارحیت کا مظاہرہ یوں کرتا ہے:" پریشان کردینے والی بات یہ ہے کہ محمد نے گیارہ بیویوں سے شادی کی جو اس وحی کی خلاف ورزی تھی جس کا اس نے خدا سے ملنے کا دعویٰ کیا تھا"۔ اور پھر " پیغمبر کی یہ روایت بھی مشہور ہے کہ اسے تین چیزیں محبوب تھیں نماز، عطر اور عورت"۔ (صفحات 32-33)

اس کے علاوہ اسی قسم کا مواد پوری کتاب میں ملتا ہے ان میں سے ایک کا بھی یہاں حوالہ

دینا اذیت کا موجب ہوگا۔ میرے خیال میں مجھے اس پر مزید وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ ڈاکٹر مائیکل علی کی اس تصنیف پر deja-vu (پہلے کہیں دیکھا ہوا ہے) ہر صفحہ پر لکھا ہوا ہے۔ لیکن جہاں تک مغرب کے قابل نفرین منصوبہ کا تعلق ہے یہ کتاب نہ ہی اتنی زوردار تھی اور نہ ہی اتنی ضرر رساں تھی کہ ہلکا سا ارتعاش پیدا کر سکے یا ایسا ارتعاش جس کی کوئی اہمیت ہو۔ یہ انتہائی بودی اور بمشکل نزاعی کتاب تھی۔

اب کسی اور چیز کی منصوبہ بندی کرنا ضروری تھا جو اس سے زیادہ ڈرامائی اور سنسنی خیز ہو۔ ایسی چیز جو ہر کسی کو چوکنا کر دے اور ہر کوئی دھیان دے۔ یہ تمام منصوبوں اور سازشوں کا معراج ہو جسے اسلام کے دو خونی دشمنوں یعنی یہود اور نصاریٰ نے مل کر تیار کیا ہو۔ قبل اس کے کہ ہم اس منصوبہ کے انجام تک آئیں اجازت دیجئے کہ میں قاری کو بعض دوسرے لازمی اجزاء کا جن کا اس منصوبہ کے پھل آور ہونے کے لازمی اجزاء ہیں ان کے بارہ میں تازہ ترین معلومات مہیا کروں۔

دور حاضر کے حملے

ابھی تک اہل مغرب کو اسلام کی قدامت پسند سوچ میں مداخلت کرنے میں کامیابی حاصل نہ ہوئی تھی۔ حریفوں کی صفوں میں کسی نہ کسی طرح شک کے بیج بونے درکار تھے۔ عیسائی اقوام اس بات سے بھی آگاہ تھیں کہ اسلام میں ایک چھوٹی سی مگر زیادہ تر خاموش آزاد خیال رائے کی جماعت موجود تھی جس کے استحصال کے لئے انہوں نے بے دھڑک کوشش کی تھی۔ شریعت کو اسطرح پیش کیا گیا کہ یہ تو اخلاقی نقطہ نگاہ سے عہد وسطیٰ کے نظریات سے ملتی جلتی تھی۔ اس کو زندگی کے نئے سوشل ڈھانچے کے مطابق ڈھالنے کیلئے بیسویں صدی کے اختتام تک کوئی کوشش نہ کی گئی تھی۔ منٹگمری واٹ کی کتاب *Islamic Fundamentalism and Modernity* کے اختتامی پیراگراف (صفحہ نمبر 143) میں مغربی مستشرقین سے وابستہ امیدیں اور توقعات پوری طرح افشا ہوگئیں۔: "جب عام فہم مسلمان اس امر سے آگاہ ہوتے کہ وہ بہشتی حالات جن کا ان کو وعدہ دیا گیا ہے تبھی پیدا ہو سکتے ہیں جبکہ وہ اسلام کے ابتدائی دور کی طرف رجوع کر جائیں۔ جبکہ ایسے حالات کا ظہور پذیر ہونا ناممکن ہے تو ان کے جذبات میں ایسے لوگوں کے خلاف شدید نفرت پیدا ہو

جاتی جو اس قسم کی حکمتِ عملی کا پرچار کرتے ہیں۔ "

کس قدر سنگین غلط فہمی کے ساتھ انہوں نے فیصلے کیئے کہ یہ تدابیر الٹا انہی پر لاگو ہو گئیں۔ واٹ کا ہر مفروضہ درست تھا کہ 'جذبات میں شدید نفرت پیدا ہو جائے' لیکن نتیجہ کیا ہوا؟ بالآخر یہ تدبیر ان ہی لوگوں کے اپنے خلاف ہو گئی جنہوں نے اس قسم کے خیال کو جنم دینے کی کوشش کی تھی۔ اور وہ اہل مغرب ہی تھے۔

باب نہم

عالمی نظام نو

دور حاضر کا ایک اور اہم مسئلہ جس کی وجہ سے مغرب نے اسلام کو تباہ و برباد کرنے کی ٹھان لی وہ درج ذیل نقطہ نگاہ سے مستنبط کیا جا سکتا ہے۔ یہ کوئی ڈھکا چھپا راز نہیں کہ آجکل کی بڑی طاقتوں نے ایک عالمی نظام نو کا خواب دیکھ رکھا ہے جس کا لیڈر امریکہ ہوگا جو اس وقت دنیا کی سب سے زیادہ طاقتور قوم تسلیم کیا جا تا ہے۔ اہل مغرب کی سوچ بچار کے مطابق سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی کا مطلب یہ ہے کہ نسل انسانی واحد عالمی نظام کی جانب قدم رنجہ ہے۔ اقوام متحدہ میں پہلے ہی ایک قسم کا سیاسی اتحاد پایا جاتا ہے جو اگر چہ زیبائش کی نوعیت کا ہے اور کسی بھی سیاسی مسئلہ کے حل کیلئے غیر مؤثر ہے۔

ایک واحد 'تیز فہم عالمی تہذیب' بنانے کیلئے بھی دنیا میں تحریک پائی جاتی ہے مگر یہ ابھی تک اتحاد سے کوسوں دور ہے۔ دنیا کی اکثر اقوام 'مغرب کے پڑھے لکھے طبقہ' کے لادینی پہلو کو قبول کر رہی ہیں۔ لیکن اس سے آگے تنوع بہت زیادہ ہے خاص طور پر مذہب کے معاملے میں۔ یہ تحریک جو متحدہ عالمی تہذیب کیلئے ہے اس کے مقاصد کو بروئے کار لانے کا مطلب ہوگا کہ تمام ادیان کو اس ابھرتے ہوئے اتحاد کیلئے اپنے رویہ کو دوبارہ زیر غور لانا ہوگا۔ خاص طور پر (فنڈامینٹلسٹ) بنیاد پرست اسلام۔ وہ اس بات کو ترجیح دیں گے کہ تمام مذاہب میں مصالحت پیدا ہو کیونکہ پیش آمدہ مستقبل میں ان کا نصب العین مذاہب کی برادری قائم کرنا ہے۔ کامل قوت اور کامل طاقت کا مالک مغرب دنیا کو یہ نظام نو دے رہا ہے۔ یہ سب کو دعوت دے رہا ہے کہ اس میں سے اپنا حصہ لے لیں بشرطیکہ وہ اس میں حصہ دار ہوں۔ اسلام سے ان کو خطرہ یہ ہے کہ یہ خود کفالت کی شیخی بگھارتا ہے اور یہ اقوام عالم میں بشمول مغرب کے جنگل میں آگ کی طرح پھیلتا جا رہا ہے۔

اسلام کے آغاز تک، عیسائیت کو چیلنج کرنیوالا نسبتاً کوئی نہ تھا۔ یہ دنیا کے تمام حصوں میں دو

عقائد کے پرچار کے ذریعہ پھیلتی رہی۔ایک یہ کہ نجات ملنا صرف اور صرف یسوع مسیح کے ذریعہ ہی ممکن تھا اور دوسرے یہ کہ عیسائیت دوسرے تمام مذاہب پر فوقیت رکھنے والا عقیدہ تھا۔اب معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی بے نظیر اشاعت کے بعد سے خصوصاً یورپ کے عیسائی بیدار ہو گئے ہیں اور اس بات کا نوٹس لے رہے ہیں کہ ان کے عالمی غلبہ کے منصوبہ کو اسلام سے حقیقی خطرہ ہے۔اب مسلمانوں کی باری ہے کہ وہ تبلیغ کریں کہ صرف اسلام ہی صراط مستقیم کی طرف سچی روشنی ہے۔ بلاشبہ اب اسلام کا پلڑا بھاری ہوگا۔

اس مسئلہ کو جو عیسائی اقوام کیلئے یقیناً مصیبت بن چکا ہے کنٹرول کرنے کیلئے انہوں نے اس رائے کو پورے زور کیساتھ آگے بڑھایا کہ متحدہ عالمی کلچر ابھر رہا ہے۔لہذا تمام مذاہب اس بات کا اعلان کریں کہ بہر کیف وہ سب کم وبیش ایک ہی چیز کیلئے کوشاں ہیں۔اس قسم کا طرز خیال کسی بھی مذہب کے پیروکاروں کیلئے خود کو دوسرے مذاہب سے برتر سمجھنے کیلئے کوئی گنجائش نہیں چھوڑے گا۔ عیسائی اقوام کیلئے تو یہ عمل ذلت کے ساتھ ہتھیار ڈال دینے کے مصداق تھا۔یہاں تک کہ واٹ بھی اپنی کتاب 'محمد ایٹ مدینہ' میں بڑا دلچسپ اور قابل ذکر تبصرہ کرتا ہے:

"ہماری دنیا روز بروز 'ون ورلڈ' بنتی جارہی ہے اور اس ایک دنیا میں یگانگت اور مماثلت کا رجحان پایا جاتا ہے۔اس رجحان کی بناء پر وہ دن بلاشبہ ضرور طلوع ہوگا جب یکساں اخلاقی اصولوں کا ایک مجموعہ ہوگا جو نہ صرف افادیت میں آفاقی ہونے کا دعویٰ کرے بلکہ حقیقتاً تمام دنیا میں تقریباً آفاقی سطح پر قبول کر لیا جائیگا۔مسلمان دعویٰ کرتے ہیں کہ محمد کردار اور اخلاق میں بنی نوع انسان کیلئے بہترین نمونہ ہے اسطرح کہنے سے وہ عالمی رائے عامہ کو دعوت دیتے ہیں کہ محمد کے بارہ میں اپنی رائے دیں۔اب تک اس امر پر کم ہی عالمی رائے دی گئی ہے لیکن اسلام کی خوبیوں کی وجہ سے اس پر آخر کار سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا۔ "(صفحہ 333)

امر واقعہ یہ ہے کہ محمد ﷺ کے کردار اور مذہب اسلام کو لوگ کافی توجہ دیتے آئے ہیں بالخصوص گذشتہ صدی کے دوران۔اور یہ کہ اس بات پر سنجیدگی سے غور کیا جاتا رہا ہے۔تسلیم کہ یہ سب کچھ ہوا لیکن غلط مقاصد کی خاطر۔

آنحضور ﷺ کے کردار پر تہمتیں

مغربی مستشرقین اور خاص طور پرواٹ نے، اس مواد سے خوب خوب فائدہ اٹھایا جو حضرت محمد ﷺ کی زندگی کے واقعات کی معمولی سے معمولی تفصیل بیان کرتا ہے۔ محمد ﷺ کی زندگی تو ایک کھلی کتاب کی مانند تھی جسے ہر کوئی آزادی کے ساتھ پڑھ سکتا تھا۔ بنی نوع انسان کی تاریخ میں کبھی کسی شخصِ واحد کے اعمال اور اقوال کو اس طرح نہیں پرکھا گیا جس طرح اسلام کے نبی محمد ﷺ کے اعمال واقوال کو پرکھا گیا ہے۔ مغربی محققین کا یہ مقصد تو کبھی تھا ہی نہیں کہ حضرت محمد ﷺ کے کردار کا کلی طور بنظر استحسان مطالعہ کریں بلکہ ہمیشہ ہی کسی نہ کسی قسم کے عیب نکالے گئے۔ جب ان کو اس مطمح نظر میں کامیابی نہ ہوئی تو انہوں نے واقعات کو دغا بازی اور دروغ بیانی کے ساتھ مسخ کر دیا۔ وہ سخت مایوس ہو کر اس نصب العین پر مرکوز ہو گئے یہاں تک کہ بعض مستشرقین نے اپنی ساری کی ساری تصانیف کو اس مقصد کیلئے وقف کر دیا۔ اس قدر کہ بالآخر انہوں نے خود کو محمد (صلعم) کی جگہ تصور کر لیا۔ اور اپنے خیال میں آپؐ کی طرح سوچنا شروع کر دیا اور اپنے جعلی اور حاسدانہ خیالات وتصورات کو جمع کر کے محمد ﷺ کی طرف منسوب کر دیا۔

دراصل حقیقی وجہ تو حسد ہے وہ کسی انسان کو ایسا کامل سمجھ ہی نہیں سکتے اور اس بات کو یقینی بنانے کیلئے کہ باقی ماندہ غیر مسلم دنیا اس 'جادوگر' اور اس 'انسان کامل' کے سحر میں پھنس نہ جائے انہوں نے آپ کی مزعومہ اخلاقی گراوٹوں اور فیصلوں میں غلطیوں کو آپ کی طرف منسوب کر کے آپ کو عام لوگوں کی طرح بنا دیا۔ پھر اخلاقی فروگزاشتوں نے ہی اسے موقعہ فراہم کیا کہ وہ اپنی خود تراشیدہ وحی کو اللہ کی طرف منسوب کر دے۔ سو اس طرح 'سٹینک ورسز' کا تصور معرض وجود میں آیا تھا۔

شیطانی اثرات

قرآن پاک کی جانچ پڑتال رسول اکرم ﷺ کے کردار کی طرح بڑھ چڑھ کر کی گئی۔ اسے سوالات کی صورت میں جانچا گیا، ایک آیت کے بعد دوسری آیت، لفظ کے بعد دوسرا لفظ، یہ کام مفسرین اور محققین نے کیا چاہے وہ مسلمان تھے یا غیر مسلم۔ لیکن عیسائی اور یہودی محققین کا

نصب العین یہی رہا کہ وہ قرآن پاک میں اندرونی تضادات تلاش کرنے کی کوشش کریں، تناقضات نکالیں، اور تاریخی حقائق کے بیان میں غلطیاں ہر صورت میں ڈھونڈیں، چاہے اس مقصد کے حصول میں افتراء اور فریب کو ہی کیوں نہ استعمال میں لانا پڑے۔

اس ضمن میں خصوصاً اہل یہود نے حسد اور کینہ کے اظہار میں مسابقت لے جانے میں پوری کوشش کی۔ آنحضور ﷺ کے دعویٰ کہ وہ اللہ سے وحی پاتے ہیں، یہ دعویٰ یہودیوں کے ہر دلعزیز عقیدہ کہ صرف یہودی ہی خدا کی پسندیدہ و چنیدہ قوم ہیں اور صرف انہی کے ذریعہ خدا اپنے آپ کو منکشف کرتا ہے، اس کی تردید کرتا تھا۔ اس حسد نے غالباً ایک دوسری توجیہہ کو جنم دیا کہ دشمنان اسلام نے کیونکر شیطانی خیالات کو نبی کریم ﷺ سے منسوب کیا؟ اسلئے تا کہ یہ ثابت ہو سکے کہ مسلمانوں کی مقدس کتاب پر خدائی منظوری کی مہر نہ ثبت ہو جائے۔ ہانس کنگ نے بھی مغربی محققین کی اس غلطی کا اپنی کتاب میں اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے کہ آیا قرآن اللہ کا کلام ہے یا نہیں، اعتراف کیا ہے: "صرف عیسائی محققین نے ہی نہیں بلکہ بعد میں لا دینی ذہنیت کے مالک مغربی دینی علماء نے بھی بغیر سوچے سمجھے قرآن کو کلام الٰہی ہونے کی بجائے اسے محمد کا کلام سمجھ کر اس کا مطالعہ کیا"۔

(*Christianity & the World Religions*, page 29)

بلکہ واٹ بھی خود اپنی کتاب میں مغربی مستشرقین کی اسلام پر غیر متوازن تنقید پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے "اگرچہ انہوں (مستشرقین) نے جو کچھ کہا سچ کہا وہ اسلام پر اپنی تنقید جس سے بطور مذہب اسلام کی اقدار اور کارناموں کی مثبت تحسین نظر آتی، اس میں توازن پیدا کرنے میں ناکام رہے۔ اس لئے یہ ہرگز باعث تعجب نہیں کہ مسلمان مستشرقین سے عناد رکھنے لگے"۔

(Muslim-Christian Encounters, page 115)

مغرب کے اونچے طبقہ کا پس منظر

ابھی تک جو دلائل پیش کئے گئے ہیں وہ کسی نہ کسی طرح وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اور تاریخی حقائق کے ذریعہ، دانستہ یا بعض صورتوں میں نادانستہ طور پر، ہماری توجہ اس زمانہ کے "رشدیوں" کی موجودہ نسل کی افزائش کی طرف مبذول کراتے ہیں۔

صورت حال کا دوبارہ جائزہ لیتے ہوئے ہم ہندوستان کو جاتے ہیں جس وقت آخری صدی کا اختتام ہو رہا تھا۔ ویسٹرن کولونیلزم کی موجودگی، آزاد خیالی کا اثر، اور اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کے دینی فکر کی تشکیل نو، جس کی پشت پناہی مغربی طاقتوں کے در پردہ عیسائی مشنری تحریک کر رہی تھی، ایک بڑی تعداد میں مسلمان اسلام سے نکل کر عیسائیت میں داخل ہو گئے۔ خیر کچھ بھی ہو، اور بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے اسلام سے عیسائیت تک کی حدود تو پار نہ کیں، مگر جب وہ اپنے تہذیبی ماحول سے غیر مطمئن ہو گئے تو انہوں نے اس سے مقابلہ کرنے کی ٹھان لی۔ وہ نسلی، لسانی اور طبقاتی ماحول میں رہنا پسند نہ کرتے تھے، وہ اپنی ہی تہذیب پر شرمندگی محسوس کرنے لگے۔ ان میں احساس کمتری پیدا ہو گیا۔ وہ مسلمان صرف نام کے تھے اور اس بات پر ہی ان کا تعلق اسلام کے ساتھ ختم ہو جاتا تھا۔ ان کی سوچ اور نقطہ نظر کلی طور پر مغربی تھے۔ ان کی سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ مغربی طرز زندگی میں وہ کسی بھی طرح قبول کر لئے جائیں۔ تو یہ تھا مغرب سے تعلیم یافتہ لوگوں کا نیا طبقہ جن میں سے اکثر نے اسلامی عالمی نقطہ نظر سے اتفاق نہ کیا۔ یہ تھے نام نہاد مغرب کے اونچے طبقہ والے جن سے سلمان رشدی کے خاندان کا تعلق تھا۔

باب دہم

سلمان رشدی کی مختصر سوانح

احمد سلمان رشدی کی پیدائش آزادی ہند سے دو ماہ قبل ممبئ شہر میں جون 1947ء کو ہوئی، جس کے بعد ایک الگ مملکت پاکستان نے جنم لیا۔اس کا دادا خالقی دہلوی ایک ڈاکٹر اور پرانی دلی میں کامیاب بزنس مین تھا۔وہ اردو کا غیر اہم مضمون نویس اور شعراء کا سرپرست تھا۔دہلوی نے اپنا نام بدل کر رشدی رکھ لیا جو عرب فلاسفر ابن رشد کے نام پر تھا جس کا وہ مداح تھا۔شاید اس نام میں ایک پیش گوئی مضمر تھی کیونکہ ابن رشد سلمان کے اپنے الفاظ میں 'قدامت پسندی کے ساتھ قدم چلا کر نہ چلتا تھا'۔

(*Waterstone's Magazine*, Autumn, 1995, page 7)

سلمان رشدی کا نانا عطاء اللہ اور نانی امیر بٹ کشمیری مسلمان تھے۔سلمان اپنے باپ انیس کے بارہ میں لکھتا ہے:"ایک المناک شخصیت، امیر آدمی کی اکلوتی نرینہ اولاد، اس نے اپنی زندگی دولت گنوا دینے میں ضائع کر دی"

(*Waterstone Magazine*, page 7)

سلمان کی پرورش ممبئ شہر میں برطانوی ماحول، برطانیہ پر مرکوز طریقہ ہائے زندگی میں ہوئی۔اپنے گورے چٹے رنگ کی وجہ سے وہ اپنے ہم وطنوں کو سفید فام لگتا تھا۔فلپ ہاورڈ (P. Howard) دی ٹائمنز اخبار کے ادبی ایڈیٹر کے الفاظ میں وہ "غلط رنگ والا، غلط مذہب والا، غلط طبقہ والا، غلط ملک کا شہری تھا"

(*The Times,* London, 15 February 1989)

جب سلمان رشدی تیرہ برس کا تھا تو اس کے باپ نے اس کو رگبی، انگلستان اعلیٰ تعلیم کیلئے روانہ کیا۔وہاں اسے مخفی نسلی برتاؤ کا پہلی بار سامنا کرنا پڑا اور اسے جلد ہی احساس ہو گیا کہ اسے انسان کی بجائے انڈین کی نظر سے زیادہ دیکھا جاتا تھا۔تعلیم ختم کرنے پر اس نے اپنے والدین

سے بھارت واپس آنیکی التجا کی، مگراس دوران اس نے کیمبرج میں ایک نمائش میں انعام حاصل کیا تھا،اس کے والدین نے اسے مجبور کیا کہ وہ کیمبرج جائے جہاں اسے کچھ کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ اس نے تاریخ کا مطالعہ کیاخصوصاً ایسی کتب کا جن پر اسلامی دنیامیں پابندی لگائی گئی تھی۔ برطانیہ میں اس کی اینگلوانڈین بے جانخوت اور قدامت پسندی ختم ہوگئی اور وہ انتہاپسند بن گیا۔

کیمبرج سے وہ پاکستان لوٹ گیا جہاں اس کے والدین نقل مکانی کر چکے تھے۔ اسے پاکستان کے نئے قائم شدہ ٹیلی ویژن محکمہ میں ملازمت مل گئی لیکن اپنے منہ پھٹ ہونے اور غیر قدامت پسندانہ خیالات کی وجہ سے اسے سیاسی مخالفت اور مذہبی تعصب کا سامنا کرنا پڑا۔اس وجہ سے اس کا اسلام سے اختلاف اورنفرت زیادہ بڑھ گئی جس کا سہرا وہ اپنے والدین کے سر باندھتا ہے، جیسا کہ رشدی خود کہتا ہے: "یہ بات کہ میری پرورش مذہب سے آزاد گھرانے میں ہوئی یہ میرے والدین کا سب سے بڑا تحفہ تھا"

(*Waterstone's Magazine*, page 7)

پاکستان سے خوف زدہ اور بددل ہوکر وہ برطانیہ واپس آ گیا اور اشتہارات کا کاپی رائٹر بن کر بمشکل تمام گزارہ کرنے لگا۔ بچے کھچے وقت میں حقیقی قلم کاری میں وقت صرف کرنے لگا۔اس کی پہلی شادی برطانوی لڑکی کلاریسا لوآرڈ (Clarissa Luard) سے ہوئی جس کے بطن سے اسکا بیٹا ظفر پیدا ہوا، جو اس وقت تیس سال کے لگ بھگ ہے۔ بعد میں اس نے اس کو طلاق دے کر ایک امریکن ناول نویس میری این وِگنز (Marianne Wiggins) سے شادی کر لی جس سے اس کی علیحدگی ہوگئی۔ پھر اس نے 1990ء میں الیز بیتھ ویسٹ (Elizabeth West) سے شادی کی جس سے اس کا بیٹا ملن پیدا ہوا۔ اس کی چوتھی شادی اپریل 2004ء میں ہندو ایکٹریس پدمالکشمی سے ہوئی جو بتیس سال کی تھی جبکہ وہ چھپن سال کا تھا۔اس کے باپ کا انتقال 1987ء میں ہوا، جو اپنے بیٹے کی قسمت کا حال جاننے سے محروم رہا۔اس کی ماں نگین پاکستان میں رہتی ہے۔اس کی تین چھوٹی بہنیں ہیں، ثمین، نرویدا اور نبیلہ۔

باب گیارہ

رشدی، عفریت کا جنم

قبل اس کے کہ میں 'سٹینک ورسز' پر حقیقت پسندی کے ساتھ نظر ڈالوں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سلمان رشدی کی گذشتہ کتابوں پر طائرانہ نظر ڈالی جائے تا اس کی ادبی طرزِ تحریر، اس کی طرز فکر اور اس کے دماغ پر مسلط خبط کا تجزیہ کیا جا سکے جس نے اس کو رسوائے زمانہ ناول لکھنے پر مجبور کر دیا۔

اس کی طرز تحریر کی قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ الجھی ہوئی اور پراگندہ قسم کی ہے۔ اس کے خیالات زیادہ تر مذہبی اور سیاسی ہیں، اور اس کے دماغ پر مسلط جنسی قسم کے خبط زیادہ مسلط ہیں جن میں فحش قسم کی گھٹیا بازاری زبان استعمال کی گئی ہے۔ رشدی کے ناولوں سے جو بات ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کے تصورات ایسے بے لگام ہیں، جن کی کوئی حد نہیں اور ان میں موجود بے لگامی مغربی قارئین کو متوجہ کرتی ہے جو غیر معمولی اور ہیجانی کیفیت کو پسند کرتے، اور اگر معمولی معمولی وقفے کے بعد اس میں سیکس اور ہوس پرستی کو شامل کر دیا جائے تو پھر مغربی قاری اس پر لٹو ہو جاتا ہے۔ یہ اس دور کا بہت بڑا المیہ ہے کہ مغرب پر ہر قسم کی سیکس کا جادو چھایا ہوا ہے، جتنا زیادہ یہ نیم وحشی ہوگا اتنا ہی اچھا ہے۔

رشدی کے ناول پڑھ کر قاری محسوس کرتا ہے کہ یہ اشاروں کنایوں اور معموں سے بھرے ہوئے ہیں۔ ان پر معمولی سا غور کرنے سے انسان یہ جان لیتا ہے کہ ان کا لکھنے والا گمراہ کن اور اشتہا پسند دماغ کا مالک ہے جو شرافت کی حدود بار بار بڑی بے شرمی اور بے حیائی کے ساتھ پھلانگ جاتا ہے۔ اس کے ناول پڑھ کر اس کے مذہب، سیاست اور سیکس کے بارہ میں خیالات معلوم ہو جاتے ہیں۔ اس کی پوشیدہ گستاخی اور ہیجانی خوف ابھر کر سطح آب پر آجاتی ہے۔ ....
سٹینک ورسز سے قبل کی تصنیفات درحقیقت ایک قسم کا عذر اور بعد میں آنیوالی رسوائے زمانہ کتاب کا

معذرت نامہ ہیں۔ جب میں اس کی گزشتہ تصنیفات کا مختصر جائزہ سلسلہ وار پیش کروں گا تو یہ بات جلد ہی نمایاں اور واضح ہو کر سامنے آجائیگی۔

گریمس Grimus

'گریمس' رشدی کا سب سے پہلا ناول تھا جو اس نے 1975ء میں لکھا تھا۔ کس کو خبر تھی کہ اس کے ان ابتدائی الفاظ کی اشاعت کے ساتھ جن سے اس کی ادبی زندگی کی ابتدا ہوئی، وہی اس کے کچھ سال کے بعد اس کی شخصیت کا عجیب اور پر اسرار رنگ میں پرتو ثابت ہوں گے۔ اس ناول کے پہلے باب کے ابتدائی الفاظ پر غور فرمائیں: "مسٹر ورجل جونز، جس کے کوئی دوست احباب نہ تھے اور جس کی زبان اس کے منہ کے حساب سے بہت لمبی تھی۔" اس حوالہ کے حساب سے مسٹر ورجل جونز بذات خود سلمان رشدی بھی کچھ سالوں بعد ہو سکتا تھا۔

'گریمس' ناول دراصل فکشن کا ناول تھا جس کو رشدی نے 'الف لیلۃ ولیلۃ' کی طرز پر لکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں اس نے صوفیاء کے تصوف کو استعمال کیا تا کہ ناول ذرا "نشاط انگیز، تصورات سے بھرپور، عجب رنگ کی صداؤں سے لدا ہوا" بن جائے۔ تصوف نے مغربی قارئین کو ہمیشہ ہی ورطہ حیرت میں ڈالے رکھا ہے اس لئے رشدی نے اپنے کیریئر کے آغاز میں ان کی توجہ کا مرکز بن کر غیر معمولی طور پر اپنا لوہا منوالیا۔ کچھ بھی ہو " گریمس " کا لوگوں نے زیادہ نوٹس نہ لیا، یہ پراگندہ قسم کا ناول تھا جس میں کوئی تسلسل، ربط نہ تھا، اس کا کوئی ادبی طرزِ تحریر نہ تھا، لیکن ایک بات جو کھل کر سامنے آ گئی وہ یہ تھی کہ رشدی پر سیکس کا خبط سوار تھا، نیز اس کا فحش، بازاری سٹائیل جو اس نے اپنی تحریر میں استعمال کیا جس سے مغربی قاری اس کا قائل ہو گیا۔ مثال کے طور پر: "میں شہر میں ایک دفعہ یوں بھاگا کہ میری سیکس باہر لٹک رہی تھی...... پھر میں نے جبکہ میری پتلون گری ہوئی تھی عورتوں کے چہروں پر ہوا خارج کی۔" (*Grimus*, page 239)

گہرے غور و فکر کے بعد انسان کو احساس ہوتا ہے کہ سٹینک ورسز ایک قسم کا گریمس ناول کا شاندار چربہ تھا۔ دونوں کتابوں میں مشابہت حیران کن ہے۔ مصنف دونوں کتابوں میں تصوف کا سفر جاری رکھتے ہوئے وقت کی حدود کو حال سے ماضی میں پھلانگ جاتا ہے، یا اس کا الٹا یعنی ماضی

سے حال۔ گریمس کو کتاب کے دو معین حصوں میں بیان کیا گیا ہے، یعنی حال کا وقت اور ماضی کا وقت۔ جبکہ سٹینک ورسز میں وہ وقت کی حدود کو زیادہ تواتر سے پھلانگتا ہے تا کہ قاری کو الجھا سکے۔ گریمس میں رشدی نے تاریخی ہستیوں کو بڑے شاطرانہ طور پر چھپا لیا ہے خاص طور پر اسلام کی بزرگ ہستیاں۔ کتاب کے دوسرے حصے Times Past میں K سے مراد لازمی طور کعبہ ہی ہے یا شاید قرآن۔ ایک آدمی کا بیان جس کو وہ سٹون کا نام دیتا ہے اس سے مراد لازماً نبی پاک ﷺ ہی ہیں۔ اس نے مسلمانوں کا اپنے مذہب کی اندھی تقلید پر نیز اس پر کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار آزادانہ طور پر نہیں کر سکتے تمسخر اڑایا ہے۔ مثلاً کتاب کے ٹائیٹل کے اندر کے صفحہ پر لکھا ہے: "تم "کے "K شہر پہنچو گے جہاں ایسے انسان ہیں جن کی آنکھوں پر دبیز پردے اور جو عجیب قسم کے شہری ہیں، جو خود کو اندھیرے میں رکھ کر اپنے اور اپنے جزیرے کے بارہ میں نا قابل قبول سچائیوں کو قبول کرتے ہیں۔"

حتیٰ کہ خدا کے تصور کا بھی تمسخر کیا گیا ہے، امر واقعہ یہ ہے کہ گریمس سے مراد خدا بذات خود ہے بمقابلہ دی گرم ریپر کے (The Grim Reaper)۔ رشدی نے بڑی ہوشیاری اور عیاری کے ساتھ قرآن پاک کی سورۃ الرحمٰن کے طرز کی نقل کی ہے جہاں اللہ کی مہربانیوں کے انکار کا ذکر آیا ہے: "یقیناً گریمس نے بڑے تحمل سے کہا، میرا تمہیں اپنے عظیم الشان تخلیق کے مطابق مکمل طور پر دوبارہ بنانے سے گویا صرف مٹی بن گئے، ...... کیا تم انکار کرتے ہو کہ تمہیں اپنا مہبط بنا کر میں نے تمہاری آئندہ زندگی کو صورت دی...... کیا تم انکار کرتے ہو کہ میں نے تمہیں کائنات میں صدیوں تک کیلئے گھومنے پھرنے کی اجازت دینے کی بجائے تمہیں یہاں لا کر میں نے وہ انسان بنایا جو الجھا ہوا، اور گرگٹ کی طرح صورت حال کے مطابق رنگ بدل لیتا ہے...... کیا تم انکار کرتے ہو......؟ کیا تم انکار کرتے ہو......؟ (پھر اس نے اپنی آواز دھیمی کرتے ہوئے کہا): اپنے رب کی کن کن نعمتوں کا تم انکار کرو گے؟ "(صفحہ 294-293)

ذرا غور فرمائیں کہ رشدی نے کس طرح قرآن پاک کے طریق بیان کو فرضی خدا، گریمس اور اس کے ایک کردار کے درمیان گفتگو میں استعمال کیا ہے۔ قرآن پاک کی متعلقہ آیات درج ذیل ہیں: اَلرَّحْمٰنُ۔ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ۔ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ (سورۃ الرحمٰن ۔55:2-5)

ترجمہ: بے انتہا رحم کرنیوالا، اور بن مانگے دینے والا، اس نے قرآن کی تعلیم دی، انسان کو پیدا کیا، اسے بیان سکھایا۔ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (آیت 14) پس تم اپنے رب کی کس کس نعمت کا انکار کرو گے؟۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ کَالْفَخَّارِ۔ (آیت 15) اس نے انسان کو مٹی کے پکائے ہوئے برتن کی طرح خشک کھنکتی ہوئی مٹی سے تخلیق کیا۔ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (آیت 17) پس تم اپنے رب کی کس کس نعمت کا انکار کرو گے؟

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سورۃ الرحمٰن کے نفس مضمون پر یہاں روشنی ڈالی جائے، جو کہ قرآن پاک کی 55ویں سورۃ ہے، یہ اس لئے کہ رشدی نے اس کی بعض آیات کو چوری چھپے اپنی تمام کتابوں میں نقل کیا ہے تا کہ وہ مذہب اسلام اور اس کے عقائد کا تمسخر جاری رکھ سکے۔

سورۃ الرحمٰن میں اسلام کے بنیادی عقائد پر روشنی ڈالی گئی ہے یعنی خدائی صفات، بالخصوص خدا کی وحدانیت، روزمحشر اور وحی۔ یہ خدا کے ان انعامات کا اعادہ کرتی ہے جو خدا نے انسان کو عطا کئے ہیں۔ ہماری زمین اپنی تمام بیش بہا چیزوں کیساتھ، گہرے سمندر اور اونچے پہاڑ انسان کیلئے ہی تخلیق کئے گئے تھے۔ لیکن خدا کی اس عظیم الشان تخلیق اور اس کے انعامات کو رشدی نے اپنی کتاب میں بڑی نخوت اور بد باطنی کے ساتھ جھٹک دیا ہے: "اپنے پر پھڑ پھڑانے والا عقاب وہاں موجود تھا جو اس کمرے میں سے ہو کر آیا تھا جہاں اونچی جگہ پر اشیاء پردے کے پیچھے پڑی تھیں، وہ تعجب کر رہا تھا کہ گریمس کے متعلق کیا چیز اچنبھہ تھی۔ اس کو سمجھ آئی کہ یہ نام نہاد عظیم الشان تخلیق دراصل بچگانہ ہے۔ جو ہر نصف تیار شدہ وہم کا کمال تھا، پھر عجیب وغریب قسم کی رسومات جو اس نے خود کو لطف دینے کیلئے بنائی تھیں جن میں سے ایک 'رقص' تھا۔ "(صفحہ 294)

رشدی نے اس موضوع پر بڑی چرب زبانی کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے۔ وہ جنت اور جہنم کے موضوع پر اس سلسلہ کلام کو جاری رکھتا ہے۔ سورۃ الرحمٰن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم نے انسان کو دانش مندانہ اور امتیاز کرنے والی صفات سے نوازا تا وہ غلط اور صحیح امور میں تفریق کر کے نیک راہوں پر گامزن ہو سکے۔ لیکن یہ سورۃ انسان کو اس امر پر بھی متنبہ کرتی ہے کہ انسان اپنی گستاخی اور خودفریبی کی وجہ سے خدائی قوانین کو نظر انداز کرنا یا توڑنا چاہتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ اپنے اوپر سزا واجب کر لیتا ہے۔

لیکن اس کے برعکس یہ سورۃ یہ بھی کہتی ہے کہ جس طرح خدائی سزا جو مجرموں اور گنہگاروں کو دی جائیگی وہ بہت خوفناک ہوگی لیکن خدا کے انعامات جو نیک لوگوں پر نازل کیے جائیں گے وہ بھی ناقابل حساب ہوں گے: يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ ۙ وَّنُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ۔ (آیت36)۔ترجمہ تم دونوں پر آگ کے شعلے برسائے جائیں گے اور ایک طرح کا دھواں بھی، پس تم دونوں بدلہ نہ لے سکو گے۔ فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ (آیت:38)، پس جب آسمان پھٹ جائیگا اور رنگے ہوئے چمڑے کی طرح سرخ ہو جائیگا۔ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ (آیت 47) جو بھی اپنے رب کے مقام سے اترتا ہے اس کیلئے دو جنتیں ہیں۔ فِيْهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ ۙ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَ لَا جَآنٌّ (آیت57) ان میں نظریں جھکائے رکھنے والی دوشیزائیں ہیں جنہیں ان سے پہلے جن وانس میں سے کسی نے مس نہیں کیا۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (آیت58) پس تم دونوں اپنے رب کی کس کس نعمت کا انکار کرو گے؟

جس طرح قرآن سزا اور ثواب کے موضوع پر روشنی ڈالتا ہے، اسی طرح رشدی حد سے زیادہ تصوراتی مگر نہایت بے حس طرزِ تحریر اپنے قاری کو لطف اندوز کرنے کیلئے استعمال میں لاتا ہے۔سزا سے متعلق وہ کہتا ہے: " گریمس ، بم سے ملحق بچہ، یا پھر خفیہ بموں کا اسلحہ، ستون کے پائے پر" (صفحہ294) ثواب کی وہ یوں وضاحت کرتا ہے:"رقص کا دوسرا حصہ، گریمس نے طعنہ دیتے ہوئے کہا، گھونگھٹ کا رقص ہے جس میں وہ کچھ دکھلایا جاتا ہے جو بہت ہی پر لطف ہے۔"(صفحہ294)

رشدی اسی موضوع کو اپنی دیگر کتابوں مڈنائٹس چلڈرن (Midnight's Children) اور شیم (Shame) میں جاری رکھتا ہے جس پر بحث آگے چل کر کتاب میں کی جائے گی۔ ایسے اور ملتے جلتے مزید واقعات تلاش کئے جاسکتے ہیں۔اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اسلام اور اس کے پاک پیغمبر کے خلاف نفرت، تمسخر اور توہین کے بیج اسکی پہلی کتاب میں بوئے گئے تھے۔مگر پہلی کتاب کے شائع ہونے تک سلمان رشدی گمنام تھا اور اس نے ادبی حلقوں میں کوئی نام پیدا نہ کیا تھا۔ خیر کچھ بھی ہو، ان لوگوں نے جنہوں نے اس کے اندر قابل اعتبار خواص اور اجزائے ترکیبی بھانپ لئے ، وہ اپنے مستقبل کے ساتھی مجرم کا اس وقت تک انتظار کر لینے کو تیار تھے جب تک کہ وہ والہانہ خوبیوں سے لیس نہ ہو جائے۔

مڈنائٹس چلڈرن Midnight's Children

مڈنائٹس چلڈرن رشدی کا دوسرا ناول تھا جو اس نے 1981ء میں قلم بند کیا۔ اس کے شائع ہونے پر اس کو متعدد ادبی ایوارڈ دئے گئے، بشمول فکشن کیلئے بوکر پرائز (Booker McConnel Prize)۔ یہ بات شاید کرشمے سے کم نہیں کہ صرف دو مرحلوں میں ایک مصنف جس کی اس سے پہلے کوئی شہرت نہ تھی راتوں رات اچانک بوکر پرائز کا حق دار بن گیا، جبکہ اس نے اس سے پہلے صرف ایک کتاب لکھی تھی۔ لیکن بلا شبہ یہ ایک کرشمہ ہی تھا، اور شاید یہ چند خفیہ طاقتوں کے طویل المیعاد منصوبے کا حصہ اور عذر تھا کہ وہ اپنے خفیہ ہتھیار کی شہرت کو عروج تک پہنچائیں اور بعد میں اس کو شک نہ کرنیوالی اسلامی دنیا پر اسلحہ کے طور پر استعمال کریں۔

کتاب کے بیرونی صفحہ کی اندرونی طرف لکھا ہے کہ یہ ناول سلیم سینائی کے متعلق ہے: جو 1001 بچوں میں سے ہے جو آدھی رات کو اس وقت پیدا ہوئے، ان میں سے ہر ایک کو خاص الخواص قابلیت عطا کی گئی تھی، اور جس کا فائدہ اور ساتھ ہی لعنت یہ تھی کہ وہ اپنے دور کے آقا بھی تھے اور آفت رسیدہ بھی"۔ کیا یہ ستم ظریفی نہیں کہ یہی بات سلمان رشدی پر لاگو ہوسکتی ہے؟ فکشن کے بارہ میں اس کی 'خاص الخواص قابلیت' نے اس کو اپنے پیشے کا ماہر ہونے کی بناء پر انعامات سے نوازا جن میں سے ایک فکشن کا بوکر پرائز تھا۔ اس کے بعد کی اس کی کتاب یعنی 'دی سٹینک ورسز' *The Stanic Verses* اس کے لئے لعنت ثابت ہوئی اور بلا شبہ وہ اپنے دور کا آفت رسیدہ بن گیا۔ کچھ بھی ہو یہ کہہ دینا بھی ضروری ہے کہ یہ لعنت اس کی کرتوتوں کی بناء پر تھی۔ وہ اپنی قسمت کا خود مالک تھا۔ قرآن پاک کی آیت سلمان رشدی کی قسمت پر چسپاں ہوتی ہے:

فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَاعَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (سورۃ النحل۔16:35) پس انہیں ان کے اعمال کی برائیاں پہنچیں اور انہیں اس نے گھیر لیا جس کے ساتھ وہ تمسخر کیا کرتے تھے۔ یہ آیت اس حقیقت کی طرف ہماری توجہ مبذول کراتی ہے کہ برے فعل کی سزا کچھ اس سے زیادہ نہیں ہوتی بلکہ برے فعل کا لازمی نتیجہ اور اس کے ہم مقدار ہوتی ہے۔

یہ ربّ العالمین کی شان ہے کہ وہ ایک انسان کی قسمت بالکل اسی طرح کر دیتا ہے جیسا کہ

اس نے اپنے زوال میں خود حصہ لیا ہو، یوں وہ نادانستہ طور پر اپنے لئے سزا کی پیش گوئی کر لیتا ہے۔ یہی چیز سلمان رشدی کے ساتھ ہوئی جس نے اپنی اول الذکر کتابوں میں بے خبری سے اپنے زوال کی پیش گوئی لفظ بہ لفظ کی تھی۔ یہ چیز وقت آنے پر قاری پر بخوبی ظاہر ہو جائیگی۔

Midnight's Children کہنے کو تو بچوں کی فکشن کی کتاب ہے (اسی لئے اسے فکشن کا ادبی ایوارڈ دیا گیا)، لیکن رشدی نے مڈ نائٹس چلڈرن کی کہانی کو ان تاریخی واقعات کے پس منظر میں استعمال کیا ہے جن کا تعلق ہندوستان میں برطانوی سلطنت کے اختتام، نیز تقسیم ہند اور پاکستان کی نئی مملکت کے قیام سے ہے۔ کتاب میں تاریخی شخصیتوں کے اصل نام استعمال کئے گئے ہیں جیسے گاندھی، جناح، ماؤنٹ بیٹن، نہرو وغیرہ۔ رشدی کا نقطہ نظر اور خیالات کتاب میں صاف صاف طور پر بیان کئے گئے ہیں، اس نے انگریزوں کا شکریہ متعدد بار ادا کیا ہے (وہ کم از کم اتنا تو کر سکتا تھا کیونکہ آرٹس کونسل آف گریٹ برٹن نے اس کو ادبی وظیفہ اور مالی امداد اس کی تمام کتابوں کیلئے دی تھی)۔ مثال کے طور پر ایک انگریز William Methwold کہیں سے نمودار ہو جاتا ہے، جو کہ کتاب کا مرکزی کردار ہے اور بڑے تحقیرانہ انداز میں کہتا ہے: "کئی سو سالوں کی فلاحی حکومت، جو یک لخت ہوا میں تحلیل ہو گئی۔ تم اس امر سے اتفاق کرو گے کہ ہم لوگ اتنے برے بھی نہیں تھے: ہم نے سڑکیں تعمیر کیں، سکول بنائے، ریل گاڑیاں، پارلیمنٹری نظام، تمام کام کی چیزیں۔ تاج محل بوسیدہ ہو کر زمین بوس ہو رہا تھا تاوقتیکہ ایک انگریز نے اس کی حفاظت کا سوچا۔ اور پھر اب اچانک آزادی"۔ (صفحات 96-95)

کتاب پر عمیق نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ رشدی کا بچپن کیسے گزرا، اس پر کن لوگوں نے اثر کیا، اس کی بنیادی تربیت، اس کی ادنیٰ خواہشات اور اس کا مذہب کے بارہ میں تحقیرانہ رویہ۔ وہ ایک کمزور عذر پیش کرتا ہے کہ اس نے اور اس جیسے افراد نے مغربی طرز معاشرت کے سامنے گھٹنے کیوں ٹیک دئے: "ہندوستان میں ہم لوگ ہمیشہ یوروپین لوگوں سے متاثر رہے ہیں" (صفحہ 182) اس کے بچپن پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کی توہین کرنا اوائل عمر سے ہی اس کی گھٹی میں پڑ گیا تھا۔ مذہب کو وہ سر درد اور اس پر عمل کرنا کڑوی دوا کے طور پر پینا سمجھتا تھا: "ہمارے خاندان میں ہم لوگ زیادہ نمازیں ادا نہ کرتے تھے ماسوا عید الفطر کے جب میرے والد

مجھے جامع مسجد عید کا تہوار منانے کیلئے لے جاتے جس کا مقصد سر پر رومال باندھ لینا اور زمین سے اپنا ماتھا ٹیکنا تھا "۔(صفحہ 178)

نماز جو کہ ایک مسلمان کے ایمان کا بنیادی حصہ ہے، اس کا مذاق اڑایا گیا اور اسے ایک طور سے سزا کہا گیا ہے۔ رشدی تقسیم ہند پر کفِ افسوس ملتا تھا اسے بھارت چھوڑ کر پاکستان آنا پڑا کیونکہ وہ مسلمان تھا اگرچہ نام کا سہی مگر تھا تو مسلمان۔ "میں اس بات سے انکار نہیں کرتا میں نے کراچی کو کبھی معاف نہیں کیا کہ وہ بمبئی نہ تھا"۔(صفحہ 299)

اسے ہندوستان کی آزادی بہت پسند تھی جہاں اس پر کوئی خاصی پابندی نہ تھی کہ وہ اسلامی آدابِ معاشرت کے مطابق زندگی گزارے۔ لیکن پاکستان جو کہ مذہب کی بنیاد پر اور اس کے عملی اظہار کیلئے بنایا گیا تھا۔ یہاں اس پر پریشر بہت زیادہ تھا کہ وہ اسلامی فرائض بجالائے۔ اسے اس بات پر شروع ہی سے تاسف رہا۔ اس کی پاکستان اور اسلام کے خلاف گہری نفرت جلد ہی ظاہر ہو جاتی ہے: "پاکستان کے سن بلوغت کے آغاز سے ہی میں نے دنیا کی خوشبوؤں کا اندازہ لگا لیا، شدید مگر بھاری بھرکم جلد ہی غائب ہو جانیوالا عشق، اور گہری مگر دیرپا جگرخراش نفرت "۔ رشدی استہزاء کے ساتھ کہتا ہے کہ کبھی بھی 'پاک سرزمین' سے اُس کا مزاج نہ مل سکے گا کیونکہ 'اس پر بمبئی کی مستقل چھاپ لگ چکی تھی، اس کے دماغ میں اللہ کے مذہب کے سوا دوسرے ہر قسم کے مذاہب تھے' اور یہ کہ 'اس کا جسم پالیدگی کی طرف فطری رغبت رکھتا تھا'، اس کی قسمت میں لکھا جا چکا تھا کہ وہ ناموزوں شخص ہی رہے گا "۔(صفحہ 301)

جس چیز کا اس کو اس وقت احساس نہ تھا وہ یہ تھا کہ وہ پوری دنیا کے سامنے کچھ ہی سالوں میں نامراد اور ناموزوں شخص بن کر کئی سال تک لوگوں سے چھپتا پھرے گا۔ رشدی نیکی اور بدی کے درمیان فرق کو واضح کرتا ہے اور مسلمہ طور پر گستاخانہ رنگ میں بدی کو ترجیح دیتا ہے: "مقدس: نقاب والا پردہ، حلال گوشت، مؤذن کیلئے مینار، جائے نماز۔ غیر مقدس: ویسٹرن ریکارڈز، سؤر کا گوشت، شراب۔ مجھے اب سمجھ آ گئی کہ عید الفطر سے ایک رات قبل ملاّ (مقدس) کیوں جہاز (غیر مقدس) پر سفر کرنے سے ہچکچاتا تھا تا وہ نئے چاند کو ضرور دیکھ سکے، بلکہ ایسی سواریوں پر بھی سوار ہونے کے لئے تیار نہیں ہوتا تھا جن کی خفیہ خوشبو غیر روحانیت کا توڑ تھی۔ مجھے اسلام اور سوشلزم میں بدبوؤں کا

ناموافق ہونا سمجھ آ گیا......   لیکن اس سے زیادہ مجھ پر ایک مہیب حقیقت عیاں ہوگئی یعنی مقدس یا اچھائی سے مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی۔" (صفحہ 308)

رشدی پر سیکس کا خبط سوار ہو گیا جب اس نے طوائفوں کے یہاں جانا شروع کیا: "میں نے جنسی گندگی اور شہوت کو معلوم کرنا چاہا۔ (میرے پاس پیسے خرچ کرنے کو تھے، میرا باپ نہ صرف دریادل بلکہ پیار کرنیوالا بن گیا تھا "۔ (صفحہ 309) لیکن اس ضمن میں سب سے زیادہ چونکا دینے والا بیان وہ مسلمانوں کی مزعومہ منافقت کے خلاف دیتا ہے: " ایسا شہر جو اپنی عورتوں کو مقفل دروازوں کے پیچھے چھپائے رکھتا ہو وہاں طوائفوں کی کمی نہیں ہوتی۔ "(صفحہ 309)

اس کا اشاروں میں کہنا کہ اسلام میں پردہ سے متعلق سخت قوانین کے باعث وہاں طوائفوں کی مانگ بہت زیادہ ہوتی ہوگی کیونکہ مردوں کی دبی ہوئی خواہشات کو کسی نہ کسی طریق سے پورا کیا جانا مطلوب ہوتا ہے۔ شہوت کے پرستار کا یہ بیان کس قدر غیر یقینی اور غیر معتبر ہے۔ سلمان رشدی نے اسلامی رسومات اور طریقوں میں کئی اور باتوں کو اچھال کر ان پر استہزاء کے رنگ میں کیچڑ اچھالا ہے۔ اسلام میں شہادت کے نظریہ اور جنت میں اس کے عوض ثواب بھی اس کے زہریلے قلم کی زد سے بچ نہیں سکا۔ ایک بار پھر وہ سورۃ الرحمٰن کا حوالہ دیتا ہے:

" شہید، پدما، ہیروز، جو خوشبو والی بہشت کیلئے روانہ ہونے والا تھا، جہاں مردوں کو چار دلگداز حوریں دی جائیں گی، ان کو جن اور انسان نے چھوا نہ ہوگا، اور عورتوں کیلئے چار مردانگی طاقت والے مرد۔" پھر تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کا انکار کرو گے "؟ جہاد بھی کیا چیز ہے، جس میں مرد لوگ ایک عظیم قربانی سے اپنے تمام گناہوں کا کفارہ ادا کر سکتے ہیں۔" (صفحہ 329)

اس کی تحریر میں چبھتے ہوئے طنز اور مسخرانہ پھبتی کو غور سے نوٹ کریں۔ لڑائی میں شہادت کا موضوع اور نیک لوگوں کو جنت میں خوبصورت ساتھیوں کا دیا جانا جن کا وعدہ قرآن پاک میں کیا گیا۔ یہ مغربی ناقدین کیلئے ہمیشہ طنز اور مذاق ہی بنا رہا ہے۔ رشدی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں کہ وہ ان مسخروں کی ٹیم میں شامل ہو جائے۔ لیکن رشدی ایک قدم اور آگے بڑھ جاتا ہے جب وہ اپنی طرف سے تخیلاتی کردار شامل کر لیتا ہے۔ قرآن پاک کی آیات : فِيْهِنَّ خَيْرٰتٌ حِسَانٌ. فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ. حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِي الْخِيَامِ. فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ . لَمْ يَطْمِثْهُنَّ

اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ۔ (سورۃ الرحمٰن۔55:71-75) ترجمہ: ان میں بہت نیک خصال دوشیزائیں ہیں۔ پس (اے جن و انس) تم دونوں اپنے رب کی کس کس نعمت کا انکار کروگے؟ محلات جیسے مکانوں میں جو اینٹ پتھر کے نہیں، ٹھہرائی ہوئی حوریں ہیں۔ پس (اے جن وانس) تم دونوں اپنے رب کی کس کس نعمت کا انکار کروگے؟ انہیں ان (جنتیوں) سے پہلے جن وانس میں سے کس نے مس نہیں کیا ہوگا۔

رشدی اس نفس مضمون کو نہایت بے غیرتی کے ساتھ استعمال میں لاتے ہوئے کہتا ہے: "اور عورتیں، ان کیلئے چار مردانگی طاقت والے مرد"۔ اس کا مقصد یقیناً قاری کے اندر نفسانی خواہش کو ابھارنا، نیز نیک لوگوں کی پارسائی اور بزرگی کو ٹھیس پہنچانا ہے جن کو اخروی زندگی میں نیک ساتھیوں کا وعدہ دیا گیا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ سب سے زیادہ خباثت والی زبان آنحضور ﷺ کی ذات مبارک کے خلاف استعمال کی گئی ہے، بلکہ رشدی اتنا دیدہ دلیر ہے کہ وہ اپنا مقابلہ آپ صلعم سے کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس پر بھی وحی کا نزول ہو چکا ہے جس سے وہ اپنی کتابیں ضبط تحریر میں لاتا ہے۔

کتاب کے ایک باب کو پورے طور پر پڑھنا لازمی ہے تا اس کے قلم میں موجود عناد اور زہر کا اندازہ لگایا جا سکے۔ اس باب میں اس نے وحی کے نظریہ کا حد سے زیادہ مذاق اڑایا ہے۔ میں یہاں صرف چند سطور کا حوالہ دوں گا تا کہ قاری کو اس کی کمینگی کا اندازہ ہو سکے: "طور سینا پر حضرت موسیٰ نے احکامات سنے، حرا کے پہاڑ پر نبی محمد (جو Mohammed, the Last But One اور Mahound کے طور پر بھی جانے جاتے ہیں) نے جبرئیل سے کلام کیا...... لیکن موسیٰ کی طرح اور حضرت محمد کی طرح، میں نے بھی پہاڑ پر آوازیں سنیں...... جبرئیل نے محمد سے کہا: پڑھو، اس کے بعد کتاب شروع ہوئی جس کا عربی میں نام القرآن ہے...... یہ حرا کے پہاڑ پر مکہ شریف کے باہر ہوا۔ دو منزلہ پہاڑی پر جو بریچ کینڈی پولز کے سامنے ہے، مجھے بھی آوازوں نے ہدایت دی کہ میں پڑھوں"۔ (صفحات 161-162)

جس طرح نبی پاک ﷺ نے اپنی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہؓ کے پاس پہلی وحی کے نزول کے بعد اپنی کیفیت بیان کی تھی اسی طرح رشدی استہزاء کے ساتھ جھوٹے الہامات کا ذکر اپنے

والدین سے کرتے ہوئے کہتا ہے:"میری کھوپڑی کے اندر آوازیں مجھ سے باتیں کر رہی تھیں۔ امی، ابو، واقعی میں سوچتا ہوں میرے خیال میں رئیس الملوک نے میرے ساتھ کلام کرنا شروع کر دیا ہے۔" (صفحہ 162) تاہم نبی پاک ﷺ کے متعلق ایک حوالہ سے رشدی کے ٹھیک اور خطرناک ارادے ابھر کر سامنے آجاتے ہیں:

"محمد (آپ پر درود اور سلام) یہاں کہتا چلوں میں کسی کو ناراض نہیں کرنا چاہتا۔" (صفحہ 161)

کیا یہ واضح طور پر طنز نہیں کہ رشدی بالکل یہی کرنا چاہتا تھا۔ وہ ایک خطرناک کھیل کھیلنا چاہتا تھا جو وقت گزرنے کے ساتھ اپنی فطرت میں ایک عفریت بن گیا جس پر اس کا کوئی کنٹرول نہ تھا۔ اس نے اپنے لئے کانٹوں کا بستر اپنی ادبی زندگی کے آغاز میں ہی بنا لیا تھا اور جلد ہی اس کو اس پر سونا پڑنا تھا۔ اس کی دھوکے بازی اور گستاخی کی بناء پر ہر کوئی اس کی قسمت کا اندازہ لگا سکتا تھا جو اس کی منتظر تھی۔:"ایک شام، ایک رات اور ایک صبح کیلئے گونگا ہونے پر میں نے یہ جاننے کی کوشش شروع کی کہ مجھے کیا ہو گیا ہے، آخر کار ذہانت کی چادر کو میں نے اپنے اوپر گرتے دیکھا جو بیل بوٹے والی تتلی کی طرح تھی میرے کندھوں پر عظمت کا لبادہ گر رہا تھا"۔(صفحہ 161)

اپنی ادبی قابلیت کی بناء پر رشدی نے سوچا تھا کہ وہ ہر قسم کے خیالات کا اظہار کر سکتا تھا اور ان کو دوسروں کے سر تھوپ کر اپنی ذات کو محفوظ رکھ سکتا تھا۔ یہ ایک قسم کی قوت، اور طاقت کا احساس تھا جو اسے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ وہ اس میں خوب مزے لوٹ رہا تھا جیسا کہ وہ صاف صاف کہتا ہے: "صبح کے ہونے تک، میں نے یہ جان لیا تھا کہ آوازیں کنٹرول کی جا سکتی ہیں، میں ایک قسم کا ریڈیو ریسیور تھا، جس کی آواز میں زیادہ یا کم کر سکتا تھا، میں خاص آوازوں کا انتخاب کر سکتا تھا، بلکہ میں ذرا سی کوشش سے نئے دریافت شدہ اندرونی کان کا بٹن بند بھی کر سکتا تھا۔ یہ بات حیران کن تھی کہ کتنی جلدی خوف دور ہو گیا"۔(صفحہ 162)

تو سلمان رشدی نے سوچا کہ اس نے اپنے اصلی جذبات کے اظہار کیلئے نیا راستہ تلاش کر لیا تھا۔ نیز فکشن کے لبادہ میں وہ اپنا پیغام دوسروں تک پہنچا سکتا تھا۔ لیکن ایسا کرنے سے جو الٹا الزام اس پر لگے وہ خود کو اُن سے قبل از وقت بری الذمہ قرار دے سکتا تھا۔ اس طریق سے وہ مختلف

موضوعات پر جیسے مذہب اور سیاست پر اپنے نظریات کا پرچار کرسکتا تھا یا ان لوگوں کے نظریات کا جو اسے پیسے دے رہے تھے۔

'مڈ نائیٹس چلڈرن' میں رشدی نے رشوت خور پاکستانی حکومت کے خلاف ایک سیاسی پیغام دینے کی کوشش کی ہے۔ مغرب کی خوشی کیلئے اس نے ہر اس چیز کو جو پاکستانی سیاست میں بری تھی اسے بے نقاب کرنیکی کوشش ہے۔ لیکن اس سیاسی پیغام پر مکمل طور پر اظہار خیال اس کے اگلے ناول شیم (Shame) میں کیا گیا ہے۔ جیسا کہ اس کے پہلے ناول پر بحث کرتے ہوئے ذکر کیا گیا اس کی قسمت سر بمہر ہو چکی تھی۔ اس کی تحریروں میں اس کا زوال مضمر تھا۔ اسی طرح مڈ نائیٹس چلڈرن میں بھی اس کے نصیب کا مقدر کتاب کے آخری الفاظ میں لکھا جا چکا تھا جو ایک رنگ میں مصنف کی قبر کا مناسب کتبہ بھی ہوسکتا تھا: "ہاں وہ مجھے پاؤں تلے روند دیں گے...... مجھے بے آواز مٹی کا مہین ذرہ بنا دیا جائیگا...... کیونکہ یہ مڈ نائیٹس چلڈرن پر لعنت ہے کہ وہ اپنے دور کے آقا اور آفت رسیدہ بھی ہوں، وہ اپنی پرائیویٹ زندگی کھودیں، کہ وہ ہجوم کے فنا کر دینے والے گرداب میں پھنس کے رہ جائیں اور امن کے ساتھ نہ تو وہ زندہ رہ سکیں اور نہ ہی مر سکیں۔" (صفحہ 446) کتنی سردرحمی کے ساتھ یہی حالت سلمان رشدی کی ہوگئی تھی۔ ایسے لگتا تھا کہ اس نے گویا اپنی قبر خود ہی کھود لی تھی۔

رشدی کی کتاب کے اس موازنہ سے قاری خود اندازہ کرسکتا ہے کہ کس طرح رشدی کو طویل المیعاد منصوبہ کے تحت زبردست قابلیت والا مصنف بنا کر پیش کیا گیا۔ اسے شہرت کے بام پر متعدد لٹریری ایوارڈ دے کر پہنچا دیا گیا بشمول فکشن کے سب سے بڑے ایوارڈ 'بوکر پرائز فار لٹریچر'۔ لیکن جب آپ اس کی کتابوں کا عمیق مطالعہ کرتے ہیں تو انسان حیرانگی کا مجسمہ بن کر پوچھتا ہے کہ یہ کتابیں کس طبقہ کیلئے لکھی گئی تھیں؟۔ یقیناً یہ مغربی قاری کے فائدہ کیلئے نہیں لکھی گئی تھیں کیونکہ کتابوں میں ہندی اور اردو الفاظ کی اس قدر بھرمار ہے کہ کوئی بھی ان زبانوں کے علم کے بغیر ان کی اہمیت کو سمجھ نہیں سکتا۔ مثلاً 'سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے، گائے والا، کچھ نہیں' وغیرہ۔ ہر دوسرا صفحہ ہندی الفاظ کے ساتھ بھرا ہوا ہے، اور اگر قاری کو ان کے معنی جاننے کیلئے ہر دفعہ ڈکشنری کا سہارا لینا پڑے تو ناول بڑی مشکل سے ختم ہو پائیگا۔

یا پھر ممکن ہے کہ یہ کتابیں ایسے یورپین اوران کے افراد خاندان کیلئے لکھی گئی تھیں جنہوں نے بھارت پر حکومت کی تھی اور جن کو ایشین زبانوں سے شناسائی اوسط درجہ سے زیادہ نہ تھی۔ کچھ بھی ہو اس کے ناولوں کے پڑھنے والوں کی تعداد بڑی محدود رہنی تھی اور اسے کسی صورت میں بوکر پرائز جیتنے کا حقدار قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ ہمیں تو ایسے آثار نظر آتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ رشدی کی شہرت ہر صورت میں بڑھائی گئی اور اسے قربانی کے بکرے کے طور پر استعمال کیا گیا۔ اسے شاید اس چیز کا علم تھا مگر اسے کسی چیز کی پرواہ نہ تھی جب تک کہ اس کو دنیا کے اعزازات ملتے رہیں اور اسے بیش بہا دولت کے وعدے دئے جائیں۔

اس سے بھی بدترین چیز ابھی آنے والی تھی۔ اس امر کی طرف اشارہ رشدی ان الفاظ میں کرتا ہے: " جبرائیل فنا ہونے والے اشخاص سے کلام نہیں کرتا...... میری کھوپڑی میں آنیوالی صدائیں ان فرشتوں سے بہت زیادہ تھیں...... میری صدائیں مقدس ہونے کی بجائے، فحش ثابت ہوئیں، اور اتنی کثیر تعداد میں جتنے مٹی کے ذرے...... لیکن میں نے صبر کی تلقین کی۔ ذرا انتظار کرو ...... مجھے اتنی جلدی نظر انداز نہ کردو"۔ (صفحہ 166)

شیم Shame

رشدی کا تیسرا ناول جو 1983ء میں منظر عام پر آیا، اس کا عنوان بہت موزوں تھا، یہ ایک نمایاں صفت کی طرف اشارہ کررہا تھا جس کی خود اس میں خاصی کمی تھی۔ جب ہم اس کے اس سے پہلے کے ناولوں کا مطالعہ کرتے ہیں، خاص طور پر رسوائے زمانہ 'دی سٹینک ورسز' کے زوال کے بعد کا، تو ہم اس بات کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ اس نے کتنی بار غلط کاموں میں ٹانگ اڑائی اور کسطرح اس کی کتابوں کے خلاف ردعمل رونما ہوا۔ اس کی ایک نمایاں مثال اس ناول کے صفحہ 39 پر ملتی ہے: "چاہے انسان ایک ملک سے کس قدر عزم کے ساتھ انخلاء کرے، انسان اپنے ساتھ کچھ نہ کچھ سامان لیکر جاتا ہے، اور اس میں کیا شک ہے کہ عمر خیام ...... جب اس پر شرم محسوس کرنے کی پابندی عائد کردی گئی ...... اوائل عمر سے ہی، اس عجیب پابندی کا اثر وہ اپنی زندگی کے آخری سالوں تک محسوس کرتا رہا"۔

عمر خیام (جو اس ناول کا مرکزی کردار ہے) کی تکلیف دہ صورتحال آخر کار خود رشدی پر لاگو ہو گئی۔ سلمان رشدی ایک ملک سے فرار ہو کر دوسرے ملک ایک خوفزدہ گیدڑ کی طرح چھپتا پھرا۔ اس کی حالت یہ تھی کہ وہ اپنے کئے پر ذرا بھی پشیمان نہ تھا۔ اس ناول میں بھی ہر وہ چیز جو اسلامی ہے اس پر اس نے مجرمانہ حملہ کیا ہے۔ مثلاً اس نے اسلامی طرز عبادت کو نشانہ استہزاء بنایا ہے: "محمد عباداللہ، جس کے ماتھے کے اوپر گٹے یا داغ کا نشان تھا اور جو اس بات کی نشانی تھا کہ وہ کٹر مذہبی انسان ہے، وہ دن میں پانچ مرتبہ جائے نماز پر ماتھا ٹیکتا تھا، اور شاید چھٹی مرتبہ بھی جو نفلی تھا "۔ (صفحہ 42-41)

دن میں پانچ مرتبہ نماز ادا کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے اور عام مسلمانوں کیلئے یہ معمول کی بات ہے، لیکن رشدی اس عمل کو ایک کٹر مذہبی شخص کی نشانی بتلاتا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ رشدی اسلام سے کس قدر برگشتہ ہو چکا ہے اور اس کو اسلام سے کس قدر نفرت ہے۔ پاکستان کیلئے اس کی نفرت اس وقت نمایاں ہو جاتی ہے جب وہ بڑی مسرت کے ساتھ اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ 'Shame' ایک افسانوی ناول ہے مگر وہاں جو کچھ سیاست میں عملاً ہو رہا تھا اور پاکستان کے عمومی طرز زندگی پر اس کو اظہار خیال کرنیکی چنداں ضرورت نہ تھی۔ وہ احمقانہ طریق سے اپنے ارادوں کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے جو سب پر عیاں ہیں۔ مثلاً وہ لکھتا ہے (صفحہ 70-69):

"اگر فرض کر لیا جائے کہ یہ ایک حقائق پر مبنی ناول تھا، ذرا سوچیں میں اس میں اور کیا کچھ لکھ سکتا تھا، مثلاً ڈیفنس (کالونی) کے امیر ترین باسیوں کا زمین دوز پانی کے پمپوں کا لگا لینا جو پانی کی مین پائپ سے اپنے ہمسایوں کا پانی چراتے ہیں...... اور کیا میں نے کراچی کے سندھ کلب کا بھی ذکر کرنا تھا جہاں ایک سائن ابھی تک لگا ہوا ہے کہ عورتوں اور کتوں کا اس سے آگے داخلہ ممنوع ہے؟...... مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کا پھانسی لگایا جانا...... یا پھر یہودیوں کے خلاف نفرت...... یا پھر سمگلنگ کا کاروبار، ہیروئین کی نشہ آور کی برآمدات کی شدت، ملٹری ڈکٹیٹرز، ضمیر فروش شہری، رشوت خور سول سرونٹ، اور بکاؤ جج حضرات" اور اس کے بعد وہ طنزیہ طور پر بات کو یوں ختم کرتا ہے: "ذرا میری مشکلات کا اندازہ لگائیں"۔

رشدی نے چکنی چپڑی باتیں کرنے کی کوشش کی ہے اور پاکستان کیلئے دو ٹوک نفرت اور

اس کے خلاف اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ ان باتوں کا پورا ذکر یہاں نہیں کرسکتا تھا کیونکہ یہ حقائق پر مبنی ناول نہیں ہے۔اس نے پاکستان کے ہر طبقہ میں رشوت خوری کا ذکر کیا ہے اور عورتوں کے مزعومہ تھرڈ کلاس شہری ہونے کا اشارہ یہ کہہ کر کیا ہے کہ سندھ کلب کراچی کے باہر یہ سائن لگا ہوا تھا،عورتیں اور کتے اندر داخل نہیں ہو سکتے۔مگر شاید سب سے زیادہ چبھتی ہوئی اور تیزابی بات اگلے دو پیراگراف میں کہی گئی ہے جن میں آئندہ ہونے والے واقعات وحالات کی طرف اشارہ ملتا ہے جن سے وہ دوچار ہونیوالا تھا۔ یاد رہے کہ یہ ناول 1983ء میں لکھا گیا تھا،یعنی 'دی سٹینک ورسز' سے پانچ سال قبل۔ ہر لفظ اور ہر فقرہ کو نوٹ کریں جنہوں نے اس کی زندگی کو درہم برہم کرنے میں بدشگون بننا تھا۔اس نے لکھا: "اب تک اگر میں اس قسم کی کتاب لکھ رہا ہوتا، اس بات سے مجھے کوئی فائدہ نہیں ہونا تھا کہ میں عالمی امور پر لکھ رہا ہوں بجائے صرف پاکستان کے۔ اس کتاب کو ضبط کرلیا جانا تھا، کتاب کچرے کے ڈبے میں پھینک دی جاتی اور نذر آتش کر دی جاتی۔اس تمام کوشش کا ماحصل کچھ بھی نہ ہونا تھا۔حقیقت نگاری بعض دفعہ مصنف کا دل توڑ دیتی ہے،خوش قسمتی سے میں تو صرف ایک جدید زمانے کی ایک من گھڑت کی کہانی سنا رہا ہوں،تو پھر ٹھیک ہے،کسی کو ناراض ہونے کی ضرورت نہیں،اور نہ ہی اسے سنجیدہ معاملہ بنانے کی ضرورت ہے۔کوئی سخت قدم اٹھانے کی ضرورت نہیں، اب تو سکھ کا سانس لے سکتا ہوں"۔(صفحہ 70)

چونکہ اس کتاب کو کم شہرت دی گئی تھی رشدی کے خیالات اور مشاہدات سے لوگ ناواقف رہے۔لیکن وہ لوگ جنہوں نے دیکھا کہ یہ ادیب ان کے بدارادوں کے پورا کرنے میں کام آ سکتا ہے وہ خوش ہو رہے تھے کیونکہ ان کو ایسا سنہری موقعہ مل گیا تھا جس کو وہ کھو دینا مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ بدشگونی کے آثار تاہم رشدی کی تحریروں میں پہلے ہی سے موجود تھے۔اور زیادہ وقت نہیں گزرا کہ وہ اس نے وہی دلائل جان بچانے کیلئے استعمال کئے۔لیکن اس کیلئے اب فرار کا کوئی راستہ نہ تھا۔اور نہ ہی کسی نے اس کی دستگیری کرنی تھی۔ بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہوا۔اس کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔اس کو اس بات کا وہم وگمان بھی نہ تھا کہ وہ تمام دلائل جو اس نے ٹھٹھا کرنے کیلئے استعمال کئے تھے وہی اس کی جان کی خلاصی کریں گے۔

عام پاکستانیوں کے ساتھ رشدی کے میل جول پر اس کا تکبر اور شرم کا احساس درج ذیل پیراگراف میں نظر آتا ہے جب وہ دیہاتیوں کے بارہ میں لکھتا ہے: "اے میرے خدا، یہ جاہل کہاں سے آگیا؟ پسماندہ قسم کے، دیہاتی گنوار، مکمل طور پر کھوٹ والے، اور میں ان کے ساتھ پھنس گیا ہوں"۔(صفحہ 74)

اسلامی عقائد اور قرآن پاک کی آیات کریمہ پر اس کی پھبتیاں بھی کتاب میں موجود ہیں جب وہ ایک بار پھر سورۃ الرحمٰن کی ایک آیت کا دوبارہ حوالہ دیتا ہے (شاید ایک یہی وہ حصہ ہے جس سے وہ واقف ہے)؛ کشمیر کے محاذ پر بھارت اور پاکستان میں جنگ کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے: "ناگزیر طور پر یہاں موتیں بھی ہوئیں لیکن جنگ کے ناظمین نے ان کا بہت اچھی طرح خیال رکھا، جو جنگ میں گھات ہوئے ان کو فرسٹ کلاس میں سیدھا ہوائی جہاز سے بہشت کے خوشبو والے باغوں میں لیجایا گیا جہاں ان کیلئے دل کش حوریں منتظر تھیں، جن کو کسی انسان نے یا جن نے چھوا نہ تھا۔ "تو پھر اپنے رب کی کن کن نعمتوں کا" قرآن سوال کرتا ہے "تم انکار کرو گے؟ (صفحہ 77)

یہ اس نفس مضمون کی ہو بہو نقل ہے جس کا استہزاء رشدی نے اپنی گزشتہ کتاب '*Midnight's Children*' میں کیا تھا۔ جس کی زبان کی پر اسرار مشابہت ان تحریروں سے ہے جو اسلام کے ابتدائی نقادوں نے استعمال کی تھی جیسے Peter The Venerable (پیٹر دی وینریبل) اور Thomas Aquinas (ٹامس ایکوینس) جن کا ذکر اس کتاب کے گزشتہ صفحات میں کیا گیا ہے۔ رشدی نے اپنی تمام کتب میں اور بالخصوص پر 'شیم' میں پاکستان کی عام زندگی کے واقعات کا ذکر کیا ہے اور جان بوجھ کر ناسوروں کو دوسروں کے سامنے رکھا ہے۔ اسی طرح وہاں پائی جانیوالی رشوت خوری، منافقت، تعصب اور ایسی تمام قبیح باتوں کا ذکر کیا جو اسلامی ریاست پاکستان میں عام ہیں۔ اس نے سیاستدانوں، نغمے گانیوالوں، فلمی ستاروں، کھلاڑیوں، مذہبی علماء، ذرائع ابلاغ، بلکہ عام دیہاتیوں کو بھی اس میں شامل کیا ہے۔ رشدی نے گویا مغرب کا ایک جاسوس بن کر کام کیا ہے تا کہ پاکستان کے اسلامی معاشرہ کے تمام قبیح افعال کو، پوری بے حیائی اور بے شرمی سے بیان کر دے۔

پاکستانی سیاست پر جب وہ قلم اٹھاتا ہے تو یہ بات جلد ہی ظاہر ہو جاتی ہے کہ وہ ذوالفقار علی

بھٹو کو زیادہ پسند کرتا ہے کیونکہ بھٹو بذات خود مغرب کی کٹھ پتلی تھا۔ بھٹو اور اس کی اولاد نے برطانیہ میں تعلیم حاصل کی اور ہر وہ چیز جس کا تعلق مغرب سے تھا ان کو ہر دلعزیز تھی۔ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ رشدی کو ضیاء الحق اور اس کے پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے سے کس قدر نفرت تھی۔ یہ بات نمایاں طور پر ظاہر ہو چکی ہے کہ ہر وہ چیز جو غیر اسلامی ہے رشدی کو بہت اچھی لگتی ہے۔ اس لئے ضیاء الحق کی اسلامی حکومت اور ضیاء کے عزائم سے اس کی شدید بیزاری فطری تھی۔ رشدی نے تخیلاتی کرداروں کے ذریعہ ضیاء الحق کے بھٹو کو پھانسی چڑھانے کا ذکر کیا ہے (صفحات 230-231)۔ بلکہ بے نظیر کی قابل رحم حالت کا بھی ذکر ہمدردی کے رنگ میں کیا گیا ہے۔ اور اس کا کردار بھی تخیلاتی کردار میں چھپا کر پیش کیا گیا۔

جن تخیلاتی کرداروں کو اس نے استعمال کیا ہے وہ اس اصل سیاسی پیغام کو چھپا نہیں سکتے جو وہ دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہے۔ وہ ضیاء حکومت کے ہر کام کے خلاف تھا اور اس نے پاکستان پیپلز پارٹی کے حق میں اپنی پسندیدگی کا اظہار کھلم کھلا کیا ہے۔ اس نے جنرل رضا کا کردار ضیاء کیلئے استعمال کر کے ضیاء کی غیر مہذب چالوں پر جان بوجھ کر روشنی ڈالی ہے تا وہ اسلام کو وحشیانہ اور غلط رنگ میں پیش کر سکے۔ مثلاً وہ کہتا ہے: "جنرل رضا نے پیغمبر اسلام کے یوم ولادت کے موقعہ پر اس چیز کا انتظام کیا کہ ملک کی ہر مسجد میں صبح نو بجے سائرن بجایا جائے اور ہر وہ شخص جو سائرن کی آواز پر عین اس وقت کھڑا نہ ہو جائے یا دعا کیلئے ہاتھ نہ اٹھائے، اسے جیل روانہ کر دیا جائے ...... اس نے اعلانیہ کہا کہ خدا اور اشتراکیت آپس میں مطابقت نہیں رکھتے، اور اسلامک سوشلزم کا وہ نعرہ جس پر پاپولر فرنٹ کی عوام کیلئے کشش تھی وہ خدا کی شان میں بدترین گستاخی تھی...... اگر عورتوں کے پیٹ ننگے نظر آتے جب وہ سڑکوں پر جا رہی ہوتیں تو مرد ان پر تھوکتے، اور رمضان کے مہینہ میں اگر کوئی سگریٹ نوشی کرتا تو گلا گھونٹ کر اسے موت کی نیند سلا یا جا سکتا تھا"۔
(صفحات 247-248)

کتاب کا ایک پورا باب جس کا عنوان 'Beauty & the Beast' ہے (صفحات 146-173) اس کا مقصد پاکستان میں عورتوں کے ساتھ سلوک کے متعلق مملکت پاکستان کو ذلیل کرنا ہے۔ ملک میں عورتوں سے مردوں کی مزعومہ بدسلوکی کو طے شدہ شادیوں کے رواج پر

اظہار خیال کرتے ہوئے نہایت ہتک آمیز رنگ میں اچھال کر پیش کیا گیا ہے کہ وہاں عورتیں زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہیں۔اس پر زیادہ سے زیادہ لکھ کر اس بات کی پوری پوری کوشش کی گئی ہے کہ پاکستان ایک غیر مہذب اور گنواروں کا ملک ہے جو مذہبی عقائد کے گرداب میں پھنسا ہوٗا ہے۔ رشدی لکھتا ہے:"عام طور پر کہا جاتا ہے اور میرے خیال میں پاکستان کے بارہ میں ٹھیک کہا جاتا ہے کہ وہاں کی خواتین مردوں کی نسبت زیادہ جاذب نظر ہیں، ......لیکن ان کی زنجیریں تخیلاتی نہیں، وہ موجود ہیں اور روز بروز وزنی ہورہی ہیں۔"(صفحہ 173)

اسلامی بنیاد پرستی کے بارہ میں مغربی محققین کے نظریات کو بھی رشدی کی تحریروں میں بیان کیا گیا ہے مگر اتنی ہی اہانت کے ساتھ۔ وہ پاکستان کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ ایک 'بدنصیب' مملکت ہے کیونکہ یہاں ان کے مذہب کے متعلق افسانوی خیالات پائے جاتے ہیں، جو رشدی کے نزدیک اس کی شہرت میں کمی کا اصل باعث ہیں۔ رشدی لکھتا ہے:"بہت کم افسانوی کہانیوں پر عمیق رنگ میں نظر دوڑائی گئی ہے، اور اگر ان کو عوام پر زبردستی ٹھونسا جائے تو وہ بہت غیر مقبول بن جاتی ہیں۔ ذرا سوچیں اگر کسی انسان کو ایک بڑی مقدار میں ہضم نہ ہونے والے کھانے زبردستی کھلائے جائیں تو انسان بیمار پڑ جاتا ہے۔ انسان غذائیت سے محروم ہو جاتا ہے۔ قاری شاید قے بھی کر دے۔ یہ مزعومہ اسلامی بنیاد پرستی پاکستان کے عوام کے اندر سے شروع نہیں ہوئی، بلکہ اس کو ان پر ٹھونسا گیا ہے ......اسی طرح مذاہب آمر حکام کی پشت پناہی کیا کرتے ہیں ایسے طاقتور الفاظ کے ذریعہ، جن کا انکار کرنے میں عوام پس و پیش کرتے ہیں۔ ان کو حقوق سے محروم کیا جاتا ہے اور ان کا استہزاء کیا جاتا ہے۔ انجام کار انسان بیمار ہو جاتا ہے اور اپنے ایمان پر اعتقاد کھو بیٹھتا ہے"۔(صفحہ 251)

اس کی گزشتہ کتابوں کی طرح 'Shame' کا اختتام بھی اس کے اپنے الفاظ میں اس انجام کو احاطہ تحریر میں لاتا ہے جو اس کا منتظر تھا۔ وہ وقت زیادہ دور نہیں جب اس کا ضرب المثل اونچا اڑنے والا غبارہ پھٹ جائیگا:"خون اور گوشت کے بنے جسم کے اندر شیم کے جانور کی طاقت کو زیادہ دیر تک دبایا نہیں جا سکتا کیونکہ یہ نشوونما پاتا ہے۔ یہ غذا کھا کر فربہ ہو جاتا ہے حتی کہ شریان پھٹ جاتی ہے"۔(صفحہ 286)

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ 'شیم' ناول کی اشاعت کے بعد سلمان رشدی پھل کی طرح پک کر

گرنے کو تیار ہو چکا تھا۔ وہ اس وقت مکمل سرشاری کی حالت میں تھا، شہرت اور دولت کی فراوانی سے شرم وحیا کی کسی رمق کے بغیر ہر طور سے وہ مخمور ہو چکا تھا۔ اس میں شیطانی صفات در آئیں تھیں۔ اس نے مکمل طور پر خود کو فروخت کر دیا تھا اور اپنے آقاؤں کی مٹھی میں کٹھ پتلی بن کر بے دست و پا ہو چکا تھا۔ اس کے بعد پانچ سال تک خموشی رہی اور پھر سلمان رشدی ادب کی تاریخ کے عالمی منظر پر اپنے رسوائے زمانہ ناول کے ساتھ بے لگام جانور کی طرح چھوڑ دیا گیا۔ اور شاید اسکی ایک خواہش یوں پوری ہوگئی کہ اس کے نام کا گھر گھر چرچا ہونے لگے مگر غلط اسباب کی بناء پر۔

دی سٹینک ورسز The Stanic Verses

سلمان رشدی اور اس کے حامیوں نے بڑے مدلل طریق سے یہ باور کرانیکی کوشش کی ہے کہ دی سٹینک ورسز ایک تخیلاتی ناول تھا اور کسی کو کوئی اختیار حاصل نہیں کہ اس کے تخیل پر پہرے بٹھائے۔ ناول کو تفصیل کے ساتھ چھان بین کرنے کے بعد قاری کو بغیر کسی شک وشبہ کے جلد ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ ناول کے تمام کردار تخیل کے سوا سب کچھ ہیں۔ رشدی اس بات پر مصر ہے کہ جو کہانی اس نے ناول میں پیش کی ہے وہ تمام کی تمام تخیلاتی ہے۔ اس کا حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ اگر چہ کہانی کا اصلیت سے کوئی تعلق نہیں لیکن یہ کہانی معروف شخصیتوں کے زندگیوں کو بنیاد بنا کر لکھی گئی ہے۔ عام طور پر فکشن کی کتابوں کے شروع میں لکھا ہوتا ہے کہ "اس کتاب کے تمام واقعات اور کردار تخیلاتی ہیں اور ان کا مقصد کسی مردہ یا زندہ شخص یا واقعہ کو بیان کرنا نہیں ہے۔" حیرانگی یہ ہے کہ رشدی نے ایسا کوئی اعلان ناول کے شروع میں نہیں دیا ہے۔

مثال کے طور میں یہاں چند اقتباسات اس ناول سے پیش کروں گا تا کہ قاری خود فیصلہ کر سکے کہ مصنف کے دفاع میں دئے جانے والے دلائل کس قدر بودے اور بے بنیاد ہیں۔ مغربی قاری چونکہ اسلامی تاریخ اور آنحضور ﷺ کے صحابہ کے اسماء گرامی سے ناواقفیت رکھتے ہیں اس لئے چند ایک پیراگراف کے مفہوم اور ان کی تعبیر پر انسان ذرا زیادہ غور نہیں کرتا۔ چنانچہ وہ اس ناول کو افسانوی مان لیتے ہیں۔ لیکن دنیا میں پھیلے ہزاروں ہزار مسلمانوں کیلئے، جو رسول اکرم ﷺ کو سب سے زیادہ عزت دیتے ہیں، یہ ایک متحدہ اور دیدہ و دانستہ کوشش تھی کہ ان کے

جذبات کو بغیر کسی وجہ کے مجروح کیا جائے۔
میرا مقصد ساری ملحدانہ زبان جو اس ناول میں استعمال کی گئی ہے اس کو بیان کرنا نہیں اور نہ ہی اسلام کی پاکباز ہستیوں کے بارہ میں جو اذیت ناک باتیں کہی گئیں ان کو بیان کرنا ہے کیونکہ ان کو احاطہ زبان میں لانے کیلئے سینکڑوں صفحات درکار ہوں گے۔ اس کی بجائے میں صرف چند مثالیں پیش کروں گا تا مصنف کے اس بودے دعویٰ کہ یہ افسانوی کتاب ہے کی قلعی کھول دی جائے۔ یوں ایک اور بات واضح ہو کر سامنے آئیگی کہ اس مصنف کو ہر وہ چیز جو اسلامی ہے اس سے کتنی نفرت ہے۔
قرآن مجید رسول اکرم ﷺ پر حضرت جبرائیل علیہ السلام کی وساطت سے نازل کیا گیا تھا۔ اردو میں انگریزی لفظ اینجل (Angel) کو فرشتہ کہتے ہیں۔ ناول کا ایک مرکزی کردار ایسے طور پر پیش کیا گیا ہے جو جبرائیل فرشتہ ہے جس کو پورے ناول کے اندر جنسیات کا بھوکا نیم دیوتا، نصف انسان، آوارہ، جو ہر قسم کی برائیوں میں خوشی محسوس کرتا ہے (جیسے زنا، محرمات سے مباشرت کرنا، اور خنزیر کھانا)، ایسا اس لئے کیا گیا ہے تا کہ یہ ثابت کیا جا سکے کہ خدا اب قادر مطلق نہیں رہا ہے۔ (صفحات 30-25)۔ کیا ایک افسانوی ناول میں ایک اسلامی پاکباز ہستی کا استعمال کیا جانا بہت ضروری تھا؟ یا کہ مصنف دنیا میں بسے لکھو کھہا مسلمانوں کے حساس جذبات سے بالکل نا آشنا تھا؟ مکہ جسے اسلامی دنیا میں سب سے معزز ترین شہر سمجھا جاتا ہے اسکو ناول میں 'جہالت کا شہر' کہا گیا ہے (صفحہ 95)۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حرامی کہا گیا ہے (نعوذ باللہ) اور آنحضور ﷺ کے صحابہ بھی اس کے زہریلے قلم سے محفوظ نہیں رہے۔ سلمان فارسیؓ کو دیگر برے ناموں کے علاوہ کسی قسم کا اوباش کہا گیا ہے۔ بلالؓ کو سیاہ فام عفریت کہا گیا ہے۔ ان دونوں معزز ہستیوں اور حضرت خالدؓ کو 'فضلے کی تثلیث، لچے لفنگے، آوارہ گرد اور بدمعاش غنڈے مسخرے' کہا گیا ہے۔ نبی پاک ﷺ کے چچا محترم حضرت حمزہؓ کی بھی توہین کی گئی ہے۔ (صفحہ 104)
کیا یہ محض اتفاق ہے کہ کتاب میں استعمال ہونیوالے تخیلاتی کردار آنحضور ﷺ کے صحابہ کرام سے ملتے جلتے ہیں؟ یا کہ اس کا مقصد دنیا کے کونے کونے میں بسے ہوئے مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کرنا تھا؟ کیا یہ محض اتفاق ہے کہ اس ناول میں وہ طوائف خانہ جس کا نام 'حجاب' رکھا گیا ہے، اور فرضی طور پر رسول اکرم ﷺ کے زمانہ میں موجود بتایا گیا ہے، یہ ایسی رنڈیوں

سے بھرا ہوا تھا جن کے نام وہی تھے جو نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات کے تھے؟
یہ ایک مانی ہوئی حقیقت ہے اور رشدی جیسا عمل نہ کرنیوالا مسلمان بھی اس امر سے واقف ہو گا کہ رسول مقبول ﷺ کی ازواج کا 'امہات المومنین' ہونیکی وجہ سے خاص عزت والا مقام تھا۔ ان کے جان بوجھ کر یوں ناول میں استعمال نے لازماً مسلمانوں میں غصے کی آگ کو بھڑکانا تھا جو اپنے لئے اس بے عزتی کو زیادہ محسوس کرتے بجائے اس کے کہ ان کی ماؤں اور بیویوں کی بے عزتی کی جائے۔ شاید رشدی نے اپنی سادگی اور حماقت میں یہ جانا کہ افسانے کے روپ میں وہ ہر بات کہنے میں آزاد ہے۔ اور اس نے اس عذر کو زیادہ ہی طول دینے کی کوشش کی ہے حتیٰ کہ اس کے حمایتی بھی اس کے اس شیطانی منصوبے پر نادم ہوئے ہوں گے۔ ناول میں رشدی کی اسلام سے نفرت ہر صفحہ پر عیاں ہے۔ وہ بڑی طعن آمیزی سے ہر اسلامی چیز پر پھبتی کستا ہے چاہے وہ کتنی ہی ادنیٰ کیوں نہ ہو۔ مثلاً وہ در پردہ الزام عائد کرتا ہے کہ مسلمان کی زندگی ضرورت سے زیادہ قوانین کے زیر پابند ہے اور یوں اس کا ضمیر آزاد نہیں ہے۔
" مومن غیر قانونی طریق سے رہتے تھے...... لیکن ان سالوں میں Mahound...... پر قانون کا خبط سوار ہو گیا...... قوانین، قوانین، قوانین...... قوانین ہر چیز کے متعلق، اگر ایک آدمی ہوا خارج کرتا ہے تو چاہئے کہ وہ ہوا کے رخ پر ایسا کرے، ایک قانون یہ کہ انسان اپنی پیٹھ صاف کرتے وقت کون سا ہاتھ استعمال کرے۔ ایسا لگتا تھا کہ زندگی کا کوئی پہلو بھی قوانین کے بغیر اور آزاد نہ تھا۔ الہام اور تلاوت میں مومنوں کو بتلایا گیا کہ وہ کس قدر کھانا تناول کریں۔ کتنی گہری نیند وہ سوئیں۔ اور مجامعت کے لئے کونسی پوزیشن خدا کے یہاں پسندیدہ ہے"۔ (صفحات 365-364)
رشدی نے اسلامی طریق نماز اور وضو کو بھی نشانہ استہزاء بنایا ہے: "وضو، ہر وقت وضو سے رہو، ٹانگیں گھٹنوں تک، بازو کہنیوں تک، اور سر گردن تک۔ خشک جسم، گیلے اعضاء، اور گیلا سر، یہ لوگ کتنے پاگل نظر آتے ہیں، غسل اور نماز ادا کرتے، اپنے گھٹنوں پر، اپنے بازوؤں، ٹانگوں اور اپنے سروں کو ہر جگہ موجود ریت کے اندر دھنستے اور اس کے بعد دوبارہ پانی اور نماز کے دَور کو دوبارہ شروع کر دیتے ہیں۔ "(صفحہ 104)
یہاں رشدی نے غلیظ زبان استعمال کر کے قوانین شریعت کا مذاق اڑایا ہے جسطرح اس

نے گزشتہ ناول 'مڈنائٹس چلڈرن' میں کیا تھا۔لیکن 'سٹینک ورسز' میں اس نے اس موضوع پر تفصیل کے ساتھ لکھا ہے اور پوری کتاب میں وہ اسلامی قوانین کے سخت ہونیکی مسلسل شکایت کرتا ہے بمقابلہ اس مادر پدر آزاد ویسٹرن سوسائٹی کے جس کا وہ فخریہ شہری ہے۔اس ناول میں کوئی چیز بھی اس مذہب سے متعلق تخیلاتی نہیں جس کا ذکر وہ مضحکہ خیز رنگ میں کرر ہا ہے بلکہ پہلے کی طرح اسلام کے خلاف مضامین اس کی گزشتہ کتابوں کی طرح اس کتاب میں بھی موجود ہیں۔

کوئی بھی مسلمان رشدی کی کتاب میں پیش کردہ مضامین کے اب تک سرسری جائزے سے ضرور آپے سے باہر ہوگیا ہوگا۔لیکن جو کچھ اس نے لکھا جیسے وہ کافی نہ تھا۔اس نے مہلک ترین زہر نبی کریم ﷺ کیلئے بچا رکھا تھا۔اس نے آنحضور ﷺ کی ذات کیلئے ماہونڈ کا نام استعمال کیا جو کہ عہد وسطیٰ میں صلیبی پروپیگنڈہ کے عین مطابق تھا جس میں نبی پاک صلعم کو 'تاریکی کے شہزادے ماہونڈ' کے روپ میں پیش کیا گیا تھا جو عیسائیت کا سب سے بڑا دشمن تھا۔اس نے 'مڈنائٹس چلڈرن' میں صاف صاف لکھا ہے کہ "پیغمبر اسلام محمد جن کا نام ماہونڈ بھی تھا"۔(صفحہ 161)

میں نے اس ناول کو بڑی ہی اذیت اور دل پر پتھر رکھ کر پڑھا اور پڑھنے کے دوران دماغ کا توازن برقرار رکھنے کی پوری کوشش کی ۔ یہ ناول بہتان اور افترا کا ایک پلندہ ہے جس میں افضل الانبیاء پاک محمد مصطفیٰ ﷺ کے خلاف بغض سے بھری گندی زبان استعمال کی گئی ہے۔میں کسی اور کو اس کے سرسری مطالعہ کا بھی نہ کہوں گا کیونکہ اگر میں اس میں سے چند مثالیں بھی دینا چاہوں تو پوری کی پوری کتاب کا حوالہ دینا ہوگا۔

اس موضوع پر بہت سارے مسلمان علماء اظہار خیال کر چکے ہیں۔صرف اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے کہ پوری کتاب میں خاتم النبیین سرور کائنات ﷺ کے خلاف مغلظات بکی گئی ہیں۔ اگرچہ آپ کے کردار پر کئے جانے والے حملے گزشتہ مستشرقین کے حملوں سے مشابہت رکھتے ہیں، مگر رشدی نے اسفل سافلین کا ثبوت آپ صلعم کے خلاف ناقابل یقین فحش زبان استعمال کر کے دیا ہے۔اس کتاب کے مصنف کو اس قسم کی واہیات کتاب لکھنے پر لٹریری ایوارڈ کا مستحق قرار دے دینا گویا مسلمانوں کی پیٹھ میں پہلے سے گھونپے ہوئے نشتر کو مزید گہرا کرنے اور اذیت دینے کیلئے گھمانے کے مترادف ہے۔

بارہواں باب

دی سٹینک ورسز کا افسانہ

اب میں 'سٹینک ورسز' کے نفس مضمون پر غائرانہ نظر ڈالوں گا یعنی کس طرح قریباً تمام مستشرقین نے اس دعویٰ کا اعادہ کیا ہے کہ رسول کریم ﷺ عام انسانی کمزوریوں سے مبرّا نہ تھے۔ اور یہ کہ بعض مواقع پر آپ کے ذہن میں شیطانی خیالات داخل ہوئے جن کا بعد میں قرآن مجید کی بعض آیات کی صورت میں نزول ہوا۔ سب سے زیادہ سورۃ النجم کی درج ذیل آیات کو پیش کیا جاتا ہے:

اَفَرَءَ یْتُمُ اللّٰتَ وَلْعُزّٰی۔ وَمَنٰوۃَ الثَّالِثَۃَ الْاُخْرٰی ۔ (سورۃ النجم۔53:20-21) (ترجمہ) پس کیا تم نے لات اور عزیٰ کو دیکھا ہے، اور تیسری منات کو بھی جو (ان کے) علاوہ ہے؟

رسول کریم ﷺ کے بعض متعصب ناقدین نے عجیب وغریب کہانی گھڑ لی ہے کہ ایک دفعہ آپ شیطان کے نرغہ میں آ گئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک روز مکہ میں جب آپ نے سورۃ النجم کی مسلمانوں اور کافروں کے روبرو تلاوت فرمائی تو تلاوت کے دوران شیطان نے آپ کی زبان پر یہ زائد الفاظ شامل کرنیکی کوشش کی: (ترجمہ) اور یہ بڑی شان والی دیویاں ہیں جن سے شفاعت کی تم امید رکھ سکتے ہو۔

اس چیز کو وہ 'محمد کی بھول چوک' اور 'بت پرستی کیساتھ سمجھوتہ' قرار دیتے اور اس کا انحصار وہ واقدی کے بیان کردہ واقعہ پر رکھتے ہیں جو پکا مفتری اور واقعات کو گھڑ لینے والا تھا۔ اس کا انحصار وہ مؤرخ طبری کی روایت پر بھی کرتے ہیں جو قابل اعتبار اور واقعات کو چھان بین کے بعد بیان کرنے والا تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان حضرات کی دیدہ دلیری ملاحظہ کیجئے کہ وہ خدا کی شان میں گستاخی والے ان کلمات کو اس عظیم بت شکن (آنحضور ﷺ) کے نام سے منسوب کرتے ہیں جس کی ساری زندگی بت پرستی کو غلط اور قابل مزمت قرار دینے میں گزری۔ جس نے اپنے مشن اور

مقصد حیات میں تن من دھن کی بازی لگادی۔ جس نے بت پرستی کے ساتھ سمجھوتہ کی تمام پیش کشوں کو نفرت سے ٹھکرادیا اور ہر قسم کی رشوت چاپلوسی خوشامد اور دھمکیاں اسے اپنے مطمح نظر سے ایک انچ بھی نہ ہٹا سکیں۔ بت پرستی کے خلاف جس کے نا قابل شکن عزم پر اللہ تعالیٰ نے خود شہادت دی ہے۔ (سورۃ الکھف 18:7)

مزید یہ کہ اس دعویٰ کی بنیاد ہی غلط ہے۔ نہ صرف یہ کہ بعد میں آنے والی آیات بلکہ تمام سورۃ بت پرستی کی مذمت اور خدا کی وحدانیت کے دلائل سے لبریز ہے۔ عجیب بات ہے کہ یہ بین حقیقت رسول کریم ﷺ کے ناقدین اور عیب جوؤں کی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ رسالت مآب ﷺ کی اس مزعومہ بھول چوک کی تاریخی شہادت بھی کوئی دستیاب نہیں۔ چراغ ہدایت قرآن کریم کے تمام مفسرین جیسے ابن کثیر اور الرازی نے اس واقعہ کو نا قابل اعتبار قرار دیا ہے۔ تمام مشہور مسلمان مفکرین جو علم حدیث کے مسلمہ ماہرین میں شمار کئے جاتے ہیں انہوں نے بھی اس کو اختراع قرار دیا ہے۔ حدیث کی چھ کتابوں صحاح ستہ میں بھی اس واقعہ کا ذکر کہیں نہیں ملتا ہے۔ امام اسماعیل بخاری کی کتاب صحیح بخاری جس کو سکالرز سب سے زیادہ معتبر کتاب تسلیم کرتے ہیں اور جو خود واقدی (من گھڑت واقعات کے موجد) کے ہم عصر تھے انہوں نے بھی اس کا ذکر کہیں نہیں کیا۔ نہ ہی نامور تاریخ دان ابن اسحٰق جس کی پیدائش ان سے چالیس سال قبل ہوئی تھی انہوں نے اس کا ذکر کیا ہے۔

لیکن شقی القلب ناقدین اور اعداء اسلام کیلئے یہ ایک سنہری موقعہ تھا کہ وہ اپنی دروغ بیانی اور فریب کو حسب دستور کام میں لاتے ہوئے بانی اسلام پر اپنے کینہ پرور حملے جاری رکھ سکیں۔ یہ ناقدین ہمیشہ اس کھوج میں لگے رہے ہیں کہ کسی طرح وہ شفیع محشر ﷺ سے غیر ارادۃً ہونے والی خطا کو دریافت کرلیں، اور جب انہیں کوئی بھول چوک ڈھونڈے نہ ملتی تو وہ اپنی طرف سے ایک گھڑ کر اسے آپؐ سے منسوب کردیتے۔ اس کی ایک مثال زیر بحث واقعہ ہے۔ کسی نامعلوم وجہ سے اس واقعہ نے بہت سے مستشرقین کو اپیل کیا اور انہوں نے اس کو اپنی کتابوں میں ہوبہو نقل کیا ہے۔ اس واقعہ کا بعض مغربی مصنفین کا ذکر کرنا اور ان سب کا ایک ہی رنگ میں اس کا ذکر کرنا، نیز رشدی نے شیطانی خیالات رکھنے کا الزام جس رنگ میں رسول اکرم ﷺ پر لگایا ان جملہ امور کا قاری کے مدنظر رکھنا ضروری ہے۔

میکسم روڈنسن (Maxime Rodinson)

آیئے اب ذرا دیکھتے ہیں میکسم روڈنسن نے کس رنگ میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔
روڈنسن اپنی کتاب 'Mohammed' میں اس واقعہ کے بارہ میں لکھتا ہے "یہ ضرور حقیقت پر مبنی ہوگا کیونکہ مسلمان مؤرخین نے اس قسم کے واقعہ کا ہرگز اختراع نہ کرنا تھا جس سے (محمد پر ہونیوالی) وحی کو ٹھیس پہنچ سکتی تھی"۔ (صفحہ 106)

وہ طبری کا حوالہ دیتا ہے جو کہ فرضی واقعات بنانے میں مشاق ہے: "جب رسول اللہ نے دیکھا کہ لوگ ان سے دور ہو رہے ہیں تو آپ کو اس بات پر سخت دکھ ہوتا کہ اللہ کے کلام اور ان لوگوں میں کتنا بعد ہے جو وہ ان کے لئے لے کر مبعوث ہوئے ہیں۔ پھر ان کے دل میں خواہش نے جنم لیا کہ ان پر ایسی وحی نازل ہو جس سے لوگ ان کے قریب ہو جائیں ...... تب اللہ نے سورۃ النجم نازل کی "جب آپ اس آیت پر پہنچے: اَفَرَءَیْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰی۔ وَمَنٰوۃَ الثَّالِثَۃَ الْاُخْرٰی [1]۔ تو شیطان نے آپ کی زبان پر وہ الفاظ رکھ دئے جو آپ اپنے دل میں کہہ رہے تھے اور جن کو آپ عوام الناس کے پاس پہنچا دینا چاہتے تھے، یعنی: "اور یہ بڑی شان والی دیویاں ہیں جن سے شفاعت کی تم امید رکھ سکتے ہو"۔

بعد میں جبرائیل نے محمد پر یہ راز فاش کیا کہ شیطان نے آپ کو دھوکہ دیا ہے، اگرچہ جبرائیل نے تسلی دی کہ یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کیونکہ اس سے پہلے انبیاء ان ہی مشکلات سے ان ہی وجوہ کی بناء پر دوچار ہوئے تھے۔ زائد آیات کو خارج کر دیا گیا اور ان کی جگہ دوسری آیات رکھ دی گئیں جو 'تین آبی پرندوں' کے دین کو مسترد کرتی تھیں۔ محمد کے تحت الشعور نے ان کو ایسی ترکیب سے آگاہ کیا جو اتحاد کے عملی راستہ کی طرف راہنمائی کرتا تھا"۔ (صفحات 107-106)

میکسم روڈنسن نے گزشتہ مستشرقین کی وضع کردہ حیرت انگیز کہانی کو لفظ بہ لفظ نقل کر کے نبی پاک ﷺ کی عام انسانی کمزوریوں کی طرف اشارہ کیا ہے جن کو وہ گزشتہ انبیاء کے برابر کی قرار دیتا ہے۔

۱۔ سورۃ النجم-53:20,21 یعنی کیا تم نے لات اور عزیٰ کو دیکھا ہے؟ اور تیسری منات کو بھی جو (ان کے) علاوہ ہے؟ (پبلشرز)

ڈاکٹر نذیر علی

ڈاکٹر نذیر علی جو انگلستان میں پہلا ایشین نژاد بشپ تھا اس نے بھی اپنی کتاب Islam, A Christian Perspective میں لکیر کا فقیر بنتے ہوئے غلط رنگ میں شیطانی خیالات کو نبی پاک ﷺ سے منسوب کیا ہے۔ ڈاکٹر علی اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ محمد ﷺ مقامی لوگوں میں اپنا پیغام قابل قبول بنانے کیلئے سمجھوتہ کرنے پر تیار ہو گئے۔ وہ کہتا ہے:

"بالآخر انسان اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اگرچہ محمد یہود و نصاریٰ کی روایت کو برقرار رکھنا چاہتا تھا لیکن وہ پرانے روایتی عرب مذہب اور تہذیب کو بھی برقرار رکھنا چاہتا تھا (شاید یہی وجہ تھی کہ وہ اولاً تین دیویوں لات، منات اور العزیٰ کو اللہ کے ساتھ شفاعت کرنیوالی تسلیم کرنے پر تیار ہو گیا تھا۔ بعد میں اس نے کہہ دیا کہ یہ آیت شیطان نے اس کے دل میں ڈال دی تھی اس لئے اسے حذف کر دیا)۔" (صفحات 25-24)

منٹگمری واٹ

اگرچہ پروفیسر واٹ اس نقطہ نظر کی تردید کرتا ہے کہ محمد ﷺ نے قرآن خود اپنے دماغ سے لکھا تھا لیکن اس کے باوجود وہ بعض آیات کو مشکوک ٹھہراتا ہے۔ ایسی آیات جن میں اس کے نزدیک بدلتی صورت حال کے پیش نظر ترمیم کر دی گئی تھی ۔ مثال کے طور پر وہ اپنی کتاب Muhammad at Medina میں ان ترمیم شدہ آیات کے بارہ میں لکھتا ہے: "ترمیم سے مراد، اگر اس فعل کو یہ نام دینا ہی ہو، الفاظ کا اضافہ یا الفاظ، جملوں اور لمبی عبارتوں کا حذف کیا جانا ہے۔ محمد نے ممکن ہے یہ بات جان لی ہو کہ ایسی تبدیلیاں شاید خدا کی وحی میں تازہ حالات کے پیش نظر ترمیم کی صورت میں ہوں۔ راسخ العقیدہ مسلمان ترمیم کو ایک حد تک صحیح جانتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ بعض آیات منسوخ ہو چکی ہیں۔" (صفحہ 326)

منٹگمری واٹ رسول کریم ﷺ کے جملہ ناقدین میں سے ایک پر جوش ناقد گنا جاتا ہے جس کی تحریر کا مشکوک طریق منہ میں کڑواہٹ کا مزہ چھوڑ جاتا ہے۔ ذرا اس کے طرز تحریر کا شاطرانہ نمونہ ملاحظہ کریں جو وہ قرآن اور تاریخ کے واقعات کو سیاق و سباق سے الگ کر کے رسول اکرمؐ

کے کردار کا ناقص ہونا اپنی کتاب *Islamic Fundamentalism and Modernity* میں پیش کرتا ہے: "محمد کا ہر رنگ میں کامل ہونا تسلیم کیا جاتا ہے، نیز یہ کہ وہ کبھی بھی بت پرست نہ تھا باوجودیکہ قرآن (93:7) اس کے خطا کار ہونے کا ذکر کرتا ہے، اور بعض دوسرے ماخذوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے مقامی بتوں کو قربانی بھی دی تھی۔ محمد کے کامل انسان ہونے کے باعث زمانۂ جدید کے مسلمان شیطانی آیات کے واقعہ کی تردید کرتے ہیں اگرچہ ممتاز مؤرخین اور مفسرین قرآن جیسے طبری اس کو تسلیم کرتے اور اس کا ثبوت قرآن کی آیت 22:52 سے بھی ملتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک موقعہ پر جب محمد اس امید سے تھا کہ قریش کے وہ لیڈر جو اس کے دشمن تھے ان کے دل جیتنے کیلئے شاید خدا سے وحی نازل ہو جائے، شیطان نے وحی میں ایسی آیات شامل کر دیں جس سے اس کو اجازت مل گئی کہ وہ تین مقامی دیویوں سے شفاعت کی امید رکھ سکتا ہے۔ محمد نے جانا کہ یہ آیت اصل وحی کا حصہ ہے چنانچہ جب اس نے ان کا اعلان کر دیا تو مکہ کے لیڈر بھی اس کے ساتھ اسلامی عبادت میں شامل ہو گئے۔ بعد میں اس کو احساس ہوا کہ اس کو ان آیات کے بارہ میں غلطی لگ گئی تھی، اس لئے اس نے ان میں ترمیم کر دی جس کے مطابق ان دیویوں کے ذریعہ شفاعت نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مکہ کے سردار اس سے علیحدہ ہو گئے۔"

(*Islamic Fundamentalism & Modernity*, pages 17-18)

مسٹر واٹ اس واقعہ کا ذکر مزید تفصیل کے ساتھ اپنی ایک اور کتاب میں کرتے ہوئے کہتا ہے: "ایک موقعہ پر جب محمد مشرک تاجروں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور اس کو پوری امید تھی کہ ان کے دل جیتنے کیلئے اس پر ضرور وحی نازل ہوگی، فوراً اس پر درج ذیل وحی نازل ہونا شروع ہو گئی:

اَفَرَءَ يْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى۔ وَمَنٰوۃَ الثَّالِثَۃَ الْاُخْرٰى[1]۔ پھر اس کے بعد اس پر دو آیات نازل ہوئیں جس کے مطابق مسلمانوں کو اجازت مل گئی کہ وہ ان دیویوں سے کہیں کہ وہ ان کی جانب سے اللہ سے جو سب سے بڑا بت تھا ان کی شفاعت کریں...... بعد میں اس کو احساس ہوا کہ بعد والی آیات کو شیطان نے شامل کر دیا تھا اور وہ اصلی نہ تھیں۔"

(*Muslim-Christian Encounters*, page 114)

اپنے دعویٰ کو مزید ٹھوس دار بنانے کیلئے پروفیسر واٹ کہتا ہے: "یہ واقعہ عیب سے منزہ

۱۔ سورۃ النجم-53:20,21 (پبلشرز)

اسلامی ماخذوں سے ہمارے تک پہنچا ہے "(صفحہ 114) اور مزید یہ کہ "یہ بات کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ کسی مسلمان نے اس واقعہ کا اختراع کرلیا ہوگا، یا یہ کہ طبری جو کہ محتاط عالم دین تھا اس نے اس کو مشکوک ذرائع سے قبول کرلیا ہوگا"(صفحہ 115)۔ منٹگمری واٹ یہی دلیل اپنی تمام کتابوں میں استعمال کرتا ہے گویا آنحضور ﷺ سے ہونیوالی اخلاقی غلطیوں کو ثابت کرنے کیلئے یہ واقعہ بہت ہی وزنی ہے۔ یوں وہ آپؐ کے کردار کو داغدار کر دیتا ہے جس کے متعلق مسلمان شیخیاں بگھارتے ہیں۔ یہ کوئی اچنبھہ کی بات نہیں کہ مغربی مصنفین کی ایک کثیر تعداد اس واقعہ کا بار بار ذکر کرتی ہے اور یہ بھی کوئی حیرت کی بات نہیں کہ ایک ناول کے عنوان کا انتخاب کرتے ہوئے اس کا نام 'شیطانی آیات' (The Stanic Verses) رکھا گیا تھا۔

کیرن آرم سٹرانگ

کیرن آرم سٹرانگ نے اپنی کتاب 'محمد' میں ایک پورا باب 'دی سٹینک ورسز' کے عنوان پر مخصوص کیا ہے۔ میری دانست میں اس نے اس واقعہ کی مختلف روایات بیان کرکے غیر جانبدارانہ اور متوازن نقطہ نظر پیش کیا ہے۔ اس نے اس واقعہ کے بعض ماخذوں پر بھی شک کا اظہار کرکے قارئین پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ اس قصے کی مکمل تصدیق کے متعلق فیصلہ خود ہی کرلیں۔

اس قصے پر اظہار خیال کرتے ہوئے وہ کہتی ہے کہ: "یہ کہانی دوسری احادیث بلکہ قرآن سے بھی اختلاف رکھتی ہے۔" پھر وہ ہمیں یاد دہانی کراتی ہے کہ "طبری جیسا مسلمان مؤرخ تمام روایات جو وہ قلم بند کرتا ہے ان کی وہ تصدیق نہیں کرتا، وہ قاری سے امید رکھتا ہے کہ وہ ان کا موازنہ دوسری روایات کے ساتھ کرکے ان کی صحت کے متعلق خود فیصلہ کرے گا (صفحہ 113)۔

آرم سٹرانگ اس بات کا انکشاف بھی کرتی ہے کہ طبری کے پاس اس واقعہ کی ایک سے زیادہ روایات تھیں "طبری نے تاریخ پر اپنی کتاب میں ایک ایسی روایت بھی قلم بند کی ہے جو اس واقعہ کا بالکل مختلف پہلو بیان کرتی ہے (صفحہ 113)۔ یوں طبری کا ماخذ اور اس کا طرز بیان بالکل ناقابل اعتبار ہو جاتے ہیں۔

اس باب میں ایک اور جگہ کیرن آرم سٹرانگ اس واقعہ کی تردید میں مسلمانوں کی طرف

سے پیش کردہ دلائل پیش کرتی ہے اور بڑے خلوص کے ساتھ ایسے موقعہ کا ذکر کرتی ہے جو اسلام کے مخالفین کو میسر ہو جانا تھا جس سے وہ فائدہ اٹھا سکتے تھے۔: "ایک بات ہمیں ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ متعدد مسلمان اس واقعہ کو بالکل غیر مستند سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن میں اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں ملتا...... نہ ہی احادیث کے مجموعوں میں ...... جو بخاری اور مسلم نے جمع کئے تھے۔ مسلمان احادیث صرف اس بناء پر رد نہیں کر دیتے کہ ان کا تجزیہ تنقیدی رنگ میں نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس لئے کہ ان کی اسناد نا کافی ہیں۔ اسلام کے مغربی معاندین نے اس واقعہ سے محمدؐ کی ظاہر و باہر خود مطلبی بیان کرنے کی کوشش کی ہے:"ایک ایسا شخص جس نے وحی خداوندی کو اپنے مقاصد کیلئے تبدیل کر دیا وہ سچا نبی کیسے ہوسکتا ہے؟ ایک سچا اور مخلص نبی ضرور خدا کی طرف سے ملنے والی وحی اور شیطانی الہام میں فرق کرنے کے قابل ہوگا۔ کیا ایک اللہ کا بندہ اپنی وحی میں صرف اس لئے تحریف کر دے گا کہ وہ پہلے سے زیادہ پیروکار حاصل کر سکے؟ (صفحہ 109)

اور یہی تو ہماری دلیل ہے یعنی مغربی اعداء اسلام نے یہ الزامات اس لئے تراش لئے تا زیر بحث آیات کریمہ کے مستند ہونے اور رسول اللہ ﷺ کے ایمان کامل اور پاکیزہ کردار کو مشتبہ ثابت کر کے آپ پر بہتان لگا دیا جائے۔

تیرھواں باب

The Stanic Verses رشدی کی نظر میں

رشدی نے اپنی رسوائے زمانہ کتاب میں Stanic Verses ''شیطانی آیات'' کا تذکرہ مسلسل کیا ہے اور اگرچہ اس نے اس موضوع کو نہایت اوچھے اور ہر ممکن مزاحیہ طریق سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے، مگر اس کے در پردہ ہتک آمیز رویہ اور زہر کو وہ چھپا نہیں سکا۔ رشدی نے بعض مغربی مصنفین کی اس موضوع پر گھڑی ہوئی کہانیوں کو استعمال میں لا کر ان کو افسانے کا لبادہ پہنا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔:"اس کے قریب پہنچ کر وہ رک گئی اور اپنی تعفن اور جہنمی آواز میں خوش الحانی سے پڑھا:' کیا تم نے لات اور منات کا سنا ہے، اور تیسری عزیٰ کو بھی جو (ان کے) علاوہ ہے؟ وہ بڑی شان والے پرندے ہیں'......لیکن خالد نے اس کو یہ کہہ کر ٹوکا' عزیٰ وہ شیطانی آیات ہیں اور تم شیطان کی بیٹی، ایسی مخلوق جس کی عبادت نہ کی جائے، بلکہ ٹھکرا دی جائے' پھر اس نے تلوار نکالی اور اس کو تہ تیغ کر دیا"۔(صفحہ 373)

رشدی کا کتاب میں بات کرتے کرتے ماضی سے حال اور حال سے ماضی میں مسلسل آنا جانا، اس کا مقصد صرف اور صرف قاری کو الجھانا اور شک میں ڈال دینا ہے۔ وہ فحش زبان اور جدید دور کی برائیوں کو بیان کر کے اشاروں کنایوں میں کہتا ہے کہ رسول کریم ﷺ کے زمانہ میں نہ صرف آپ کے صحابہ کرام رضوان اللہ بلکہ آپؐ میں بھی انسانی کمزوریاں ہوں گی۔ مثلاً کاتبوں کے قرآن مجید کے لکھنے کے متعلق رشدی اس مفروضہ کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ بعض مواقع پر محمد ﷺ کاتبین وحی کی کتابت کی غلطیوں کو نظر انداز کر دیا کرتے تھے۔ سلمان فارسیؓ کے بارہ میں وہ لکھتا ہے:

"جب وہ نبی کے پاؤں میں قانون، قانون، قانون قلم بند کرنے کیلئے بیٹھتا تو اس نے چپکے چپکے خفیہ طور پر وحی کو بدلنا شروع کر دیا۔ پہلے وہ معمولی تبدیلیاں کرتا تھا۔ اگر ماہونڈ نے آیت

لکھنے کو کہا جس میں خدا کو سمیع علیم کہا گیا تھا، تو میں لکھتا تھا سمیع حکیم۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ماہونڈ نے ایسی تبدیلیوں کو محسوس نہ کیا، تو دیکھو میں صحیفہ لکھ رہا تھا یا یوں کہہ لو دوبارہ لکھ کر میں خدا کے الفاظ کی بے حرمتی کر کے اس کو اپنی بے ادب زبان میں قلمبند کر رہا تھا۔" (صفحہ 367)

تمام کتاب میں اسی موضوع کو مدنظر رکھ کر اظہار خیال کیا گیا ہے مگر اس واقعہ کے بیان کرنے میں اس نے جو غلیظ زبان استعمال کی ہے وہ کاری ضرب کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے ساتھ اس نے کینہ پروری کا ثبوت دیتے ہوئے نبی پاک ﷺ کی ذات، آپکی ازواج مطہرات اور صحابہ کرام پر بہتان لگائے ہیں۔ اس نے تاریخ اسلام کے تمام اصلی واقعات اصلی نام اور اصلی حالات استعمال کئے ہیں۔ سارے مواد کو اس نے فکشن کے رنگ میں پیش کیا ہے۔ مثال کے طور پر میں یہاں چند عبارتیں نقل کرتا ہوں:

"اس کا نام، اس کا خوابیدہ نام اگر اسے صحیح تلفظ کے ساتھ ادا کیا جائے تو اس کے معنی ہیں ایسا شخص جس کے لئے تشکر کیا جائے لیکن وہ اس کا جواب یہاں نہیں دیتا ہے...... یہاں وہ نہ تو Mahomet، نہ ہی Moe Hammered ہے۔ بلکہ اس نے گلے میں وہ پٹہ ڈال لیا ہے جو فرنگی لوگ اپنی گردن کے گرد باندھتے ہیں...... پہاڑ پر چڑھنے والا، نبی بننے کا شوقین خلوت گزیں، عہد وسطیٰ میں بچوں میں خوف و ہراس پیدا کرنے والا، شیطان کا مترادف Mahound ہے"۔ (صفحہ 93)

"ماہونڈ کی حالت نہایت دردناک ہے۔ وہ سوال کرتا ہے: کیا یہ ممکن ہے کہ وہ فرشتے ہیں؟ لات، منات، عزیٰ۔۔۔ کیا میں ان کو فرشتوں کی صفات والے کہہ سکتا ہوں؟ کیا یہ خدا کی بیٹیاں ہیں؟...... کیا اللہ اس قدر اکڑ باز ہے کہ وہ نوع انسانی کو بچانے کیلئے تین اور کو قبول نہ کرے گا"۔ (صفحہ 111)

"وہ (Mahound) تین دیویوں کی مورتیوں کے سامنے کھڑا ہوتا ہے اور آیات کی تنسیخ کا اعلان کرتا ہے جو شیطان نے اس کے کان میں پھونک دی تھیں۔ یہ آیات اصل صحیفہ قرآن سے حذف کر دی گئی تھیں۔ ان کی جگہ نئی آیات شامل کر دی گئی تھیں' کیا اس کیلئے تو بیٹیاں اور تمہارے لئے بیٹے ہوں گے؟' ماہونڈ کہتا ہے یہ بٹوارہ قابل قبول ہوگا۔ (صفحہ 124)

"اس نے عائشہ کی طرف رخ کیا، کوئی معبود نہیں ہے اس نے بڑی سختی سے کہا، خدا کے سوا اور کوئی خدا نہیں اور محمد اس کا نبی ہے" خاتون نے جواب دیا۔(صفحہ 239)

جنگ خندق کا بھی ذکر کیا گیا ہے: "سلمان نے پیغمبر کو قائل کر لیا کہ نخلستان والی آبادی کے ارد گرد خندق کھودی جائے......ایک خندق، جس کے نیچے تیز دھار چوبیں ہوں۔ جب جاہلین نے ان کو غیر معقول قسم کی سرنگ کھودتے دیکھا تو ان کی بہادری اور بڑائی کے احساس نے ان کو مجبور کیا کہ وہ ایسا طرز عمل دکھائیں کہ گویا خندق کھودی نہیں گئی، بلکہ اپنے گھوڑوں کو پورے زور کے ساتھ دوڑاتے چلے جائیں......ایک مہاجر سے امید رکھو کہ وہ آپ کا ساتھ دے گا"۔(صفحہ 365)

حضرت سلمان فارسیؓ

یہاں یہ بیان کر دینا سودمند ہوگا کہ سلمان فارسیؓ کون تھے کیونکہ اس سے یہ بات واضح ہو جائیگی کہ وہ رشدی کے زہریلے قلم کا نشانہ کیوں بنے؟ سلمان کی پیدائش اصفہان کے قریب گاؤں Jayy میں زرتشتی والدین کے یہاں ہوئی۔ عیسائیت قبول کرنے کے بعد وہ عنفوان شباب میں ہی شام چلے گئے۔ یہاں وہ ایک نہایت بزرگ بشپ کے رفیق بن گئے جس نے بستر مرگ پر سلمان کو تاکید کی کہ وہ موصل کے بشپ کے پاس جائیں جو اگرچہ ضعیف العمر تھا مگر اس کے نزدیک پارسا انسان تھا۔ سلمان نے شمالی عراق کی طرف سفر کیا، ایسا سفر جو عیسائی ولیوں کے ساتھ ان کی دوستی کا باعث بنا۔ حتی کہ ان ولیوں میں سے آخری ولی نے بستر مرگ پر سلمان کو بتلایا کہ ایک نبی کی بعثت کا وقت آن پہنچا ہے۔ اس نے کہا:

" وہ ابراہیم کے دین کے ساتھ بھیجا جائیگا اور عرب میں مبعوث ہوگا جہاں وہ اپنے آبائی وطن سے ہجرت کر کے دو پہاڑوں کے درمیان واقع کھجوروں کے علاقہ میں آئیگا۔ اس کے حق میں ہونے والے نشانات ظاہر و باہر ہوں گے: وہ تحفہ والے کھانے میں سے کھائیگا مگر صدقہ میں سے نہیں، اور اس کے کندھوں کے درمیان نبوت کی مہر ہوگی۔"

سلمان نے تہیہ کر لیا کہ وہ اس نبی کو ضرور بہ ضرور تلاش کریں گے اور کلب قبیلہ کے تاجروں کی جماعت کو پیسے دے کر کہا کہ وہ ان کو اپنے ہمراہ حجاز لے جائیں۔ مگر جب وہ بحیرہ احمر کے شمال

میں خلیج عقبہ کے پاس وادی القریٰ میں پہنچے تو تاجروں نے ان کو ایک یہودی کے پاس بطور غلام فروخت کر دیا۔

وادی القریٰ میں کھجوروں کے درخت دیکھ کر وہ ورطہ حیرت میں پڑ گئے کہ شاید یہ وہی قریہ ہو جس کی تلاش میں وہ سرگرداں ہیں۔ ان کے یہودی مالک نے ان کو مدینہ کے قبیلہ بنی قریظہ کے یہودی رشتہ دار کے پاس فروخت کر دیا۔ سلمان کے نئے آقا کا ایک چچا زاد بھائی قبہ میں رہتا تھا جو سرور کائنات ﷺ کی آمد کی خبر سن کر مدینہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ سلمان ایک روز درخت کے بہت اوپر کام میں مصروف تھے جبکہ ان کا مالک درخت کے سائے میں بیٹھا ہوا تھا۔ جب سلمان نے قبہ سے آئے ہوئے یہودی سے اپنے چچا زاد بھائی کو یہ بتلاتے سنا کہ وہاں ایک ایسا شخص وارد ہوا ہے جو نبی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، تو سلمان کو یقین ہو گیا کہ ان کی امیدیں بر آنے لگی ہیں۔ ان پر اس خبر کا اس قدر اثر ہوا کہ ان کا سارا جسم کانپنے لگا اور وہ قریب قریب درخت سے گرنے لگے تھے۔ اس شام وہ اپنے مالک کے گھر سے خموشی سے نکل کر قبہ پہنچ گئے جہاں انہوں نے نبی کریم ﷺ کو اپنے صحابہ کرامؓ کے ساتھ بیٹھے دیکھا۔ سلمان آپؐ کے سامنے آئے اور کچھ کھانے کی اشیاء بطور خیرات کہہ کر پیش کیں۔ نبی کریم ﷺ نے حاضرین کو ارشاد فرمایا کہ کھانے کو تناول کریں مگر خود کچھ نہ کھایا۔ اگر چہ وہ آپؐ کی صداقت کے قائل اسی لمحہ ہو گئے تھے جب ان کی آپؐ پر نظر پڑی تھی مگر جب آپ حضورؐ نے کھانے سے اجتناب کیا تو وہ اور بھی زیادہ قائل ہو گئے۔ حضور ﷺ سے ان کی دوسری ملاقات حضرت اسدؓ کے جنازہ کے موقعہ پر ہوئی جس کی تفصیل انہوں نے کئی سال بعد اپنے بیٹے عباس کو یوں سنائی تھی:

"میں رسول اللہ کے پاس گیا جب آپ بقیع الغرقد (مدینہ کے جنوب مشرق میں واقع قبرستان) میں تشریف فرما تھے۔ آپؐ وہاں اپنے ایک صحابی کے جنازہ کے ہمراہ گئے تھے۔ تدفین کے بعد جب آپؐ اپنے چند صحابہ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے تو میں نے سلام عرض کیا اور آپؐ کے گرد یوں گھوما کہ کسی طرح مہر نبوت کو دیکھ سکوں۔ آپ کو معلوم ہو گیا کہ میں کیا چاہتا تھا، تو آپ نے اپنا چوغہ اپنی کمر سے اتار کر پھینک دیا اور میں نے وہ مہر نبوت دیکھ لی جس کا ذکر میرے مرشد نے مجھ سے کیا تھا۔ میں نے جھک کر مہر نبوت کو بوسہ دیا اور رونے لگا۔ تب رسول اللہ نے مجھے حکم دیا کہ میں

آپ کے سامنے آؤں، میں آپ کے سامنے آ کر بیٹھ گیا، آپ کو اپنی روئیداد سنائی اور مجھے خوشی ہوئی کہ آپ کے صحابہ بھی اسے سن سکے۔ اس کے بعد میں حلقہ بگوش اسلام ہو گیا"

(Extracts from *Mohammad* by Martin Lings)

حضرت سلمان فارسیؓ کا شرفاء جیسا کردار ان کے عادات و اطوار اور صداقت کی پہچان سے صاف نظر آتا تھا مگر ایسی برگزیدہ ہستیوں کی بدگوئی کرنے سے بھی رشدی باز نہیں رہا۔ امر واقعہ تو یہ ہے کہ سلمان رشدی کی تحریروں میں یہ بات نظر آتی ہے کہ وہ مسلمانوں کے جذبات کا کوئی احترام نہیں کرتا چاہے ان کا تعلق کسی بھی فرقہ سے ہو۔ اس کی تحریروں میں فکشن کا مصنوعی لبادہ جسے وہ اپنے در پردہ محرکات کو چھپانے کیلئے استعمال کرتا ہے وہ نا قابل یقین حد تک ظاہر و باہر ہے۔ اگرچہ اس نے ایک پوری کتاب شیم (Shame) کے نام سے لکھی ہے یہ ایک ایسی صفت ہے جو اس میں بالکل مفقود ہے۔ جب اس کا دل رسول اللہ کے خلاف دشنام طرازی کر کے نہیں بھرتا تو وہ آپ کے معزز صحابہ کرامؓ کی عزت مٹی میں ملانے کے درپے ہو جاتا ہے جو زخم پر نمک چھڑکنے سے مترادف ہے۔ بلکہ وہ صحابہ کرامؓ جن کو تمام اسلامی فرقے عزت کی نگاہ سے دیکھتے، وہ صحابہ جن کی زندگیوں کی مثالیں دیکھ کر لوگ مدح اور احترام کے گن گاتے ہیں ان کو بھی اس نے نہیں بخشا۔ ان اصحاب میں سے ایک بزرگ انسان سلمان فارسیؓ تھے، جن کی اسلام کے لئے قربانیاں اور ان کی وفاداری کو تمام اسلامی دنیا تسلیم کرتی ہے۔ آپ کے علم اور اخلاص کا اعتراف تو خود رسول مقبول ﷺ نے کیا تھا۔

ایک اور واقعہ اس بیان کی صداقت پر گواہ ہے جو شاید حضرت سلمان فارسیؓ کی تاریخ اسلام میں سب سے مشہور خدمت بھی تھی۔ اور یہی واقعہ سلمان رشدی نے 'دی سٹینک ورسز' میں حسب معمول تحقیرانہ انداز میں پیش کیا ہے (صفحہ 365)۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں کو مکہ سے یثرب جو مکہ کے شمال میں 250 میل کے فاصلہ پر واقعہ تھا، ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ (بعد میں یثرب مدینۃ النبی کے نام سے معروف ہوا، یا صرف مدینہ)۔ فخر کائنات ﷺ کی ہجرت کے موقعہ پر مدینہ میں کچھ مقامی لوگوں کی ایسی تعداد موجود تھی جو اسلام قبول کر چکے تھے، ان کو انصار کہتے تھے۔ وہ مسلمان جنہوں نے مدینہ رسول اللہ کے ساتھ ہجرت کی یا ان کے بعد، ان کا نام

مہاجرین تھا۔ یہاں مسلمان کئی سال تک مقیم رہے مگر قریش کے حملے کا خطرہ ہر وقت موجود رہتا تھا جو رفتہ رفتہ دیگر مقامی قبائل پر اپنا سیاسی اثر جمارہے تھے۔ ایک موقعہ پر قریش نے مدینہ پر حملہ کرنے کیلئے دس ہزار سپاہی جمع کر لئے تھے تا اسلام کو ہمیشہ ہمیش کیلئے صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے۔

مسلمان تعداد اور اسلحہ میں بہت قلیل تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ کو قریش کے جلد ہونیوالے حملہ کا علم ہوا تو آپ نے صحابہ کو مشورہ کیلئے طلب کیا۔ سلمان فارسیؓ ان میں سے ایک تھے۔ آپ نے تجویز کیا کہ مسلمان مدینہ کے اس حصہ کے گرد وسیع خندق کھود کر خود کو محفوظ کر سکتے ہیں جو حملہ کی زد میں تھا۔ رسول اللہ ﷺ کو یہ مشورہ پسند آیا اور آپؐ نے خندق کھودنے کا ارشاد فرمایا، کھدائی کا یہ کام انصار اور مہاجرین کے درمیان تقسیم کر دیا گیا، مگر سوال پیدا ہوا کہ سلمان فارسیؓ کس گروہ کے ساتھ کام کریں گے؟ یہ سوال نبی کریم ﷺ سے کیا گیا تو آپ نے چہرہ مبارک پر مسکراہٹ لاتے ہوئے فرمایا: "سلمان نہ تو انصار سے ہے اور نہ مہاجرین میں سے، وہ میرے خاندان میں سے اور ہم میں سے ایک ہے"۔ اس کے بعد سلمان فارسیؓ کو ہمیشہ اہل بیت میں شمار کیا گیا۔ اس واقعہ سے سلمان فارسیؓ کی عظمت و رفعت تاریخ اسلام میں واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے مگر اس کے باوجود سلمان رشدی پر اس بات کوئی اثر نہیں ہوتا کیونکہ وہ اس قسم کے بیش بہا موتیوں کو غلاظت میں ملانے پر تلا ہوا تھا۔ سب سے برا سلوک اس نے نبی پاک ﷺ اور آپؐ کی ازواج مطہرات کے ساتھ کیا ہے۔ اسلامی تعلیمات کو نشانہ تضحیک بنایا ہے اور برگزیدہ ہستیوں کو بری طرح روندا گیا ہے۔ آزادی تقریر کی جنگ لڑنے کی خاطر اس نے عام رواداری کو بہت دور پھینک دیا ہے، حتیٰ کہ اس کو اپنے ہی جیسے انسانوں کے جذبات کا ذرا بھی احساس نہیں رہتا۔

رسول اللہ ﷺ کے خلاف مزید الزامات

ہم ایک بار پھر 'The Stanic Verses' کی طرف لوٹتے ہیں جس میں کثرت ازدواج اور رسول کریم ﷺ کی جنسی عیاشی (معاذ اللہ) کو ایسے زہریلے قلم میں ڈبو کر لکھا گیا ہے جو سم قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔ رشدی لکھتا ہے: "یثرب کی خندق کے باوجود مومنین کے بہت سارے سپاہی جاہلیہ کی فوج کے ہاتھوں مارے گئے ...... اور لڑائی کے بعد جبرائیل بچ جانے

والے مردوں کو نصیحت کر رہا تھا کہ وہ بیوہ عورتوں سے شادی کریں ......سلمان نے رونا شروع کر دیا، بلکہ ہیں کہا گیا کہ اگر ہم پہلے شادی شدہ ہیں تو کوئی بات نہیں، ہم چار شادیاں کر سکتے تھے اگر ہم میں استطاعت ہو، تو اندازہ کریں عورتیں اس حکم پر رضامند ہو گئیں۔لیکن جن امور پر سلمان اور ماہونڈ میں علیحدگی ہوگئی وہ یہ تھیں: عورتوں کا مسئلہ، اور شیطانی آیات ۔ بات سنو میں کوئی گپی نہیں ہوں، سلمان نے شراب کے نشے میں کہا، مگر اس کی بیوی کی وفات کے بعد ماہونڈ فرشتہ نہ رہا تھا، تم میرا مطلب سمجھتے ہو......وہ عورتیں جنہوں نے اس کے سر کے نصف بال سفید کر دئے......وہ ماؤں اور بیٹیوں کیلئے رضامند ہو گیا، ذرا پہلی بیوی اور عائشہ کا سوچو، ایک بہت بوڑھی اور دوسری بہت جوان، اس کی دو معشوقیں"۔ (صفحہ 366)

" کتنی بیویاں؟ بارہ اور ایک بوڑھی عورت، جو بہت سال قبل مرگئی تھی۔ پردے کے پیچھے کتنی داشتائیں؟ ......ایک بار پھر بارہ ...... جب جاہلیہ کے شہر میں یہ خبر پھیل گئی کہ پردے والی داشتاؤں نے ماہونڈ کی ہر ایک بیوی کی شناخت اختیار کر لی تھی، تو شہر کے مردوں کے پوشیدہ جذبات میں شدت آ گئی......تو پھر پیغمبر کی غیر موجودگی میں جاہلیہ شہر کے لوگ پردہ کی طرف دوڑے آئے جس سے ان کے کاروبار میں تین سو فی صد اضافہ ہو گیا...... پیسے دینے والے عوام میں پندرہ سالہ طوائف عائشہ بہت مقبول تھی بالکل جس طرح اس کی ہم نام ماہونڈ کو ہر دلعزیز تھی۔" (صفحہ 380/381)

رشدی اس بات کا بھی استہزاء کرتا ہے کہ محمد ﷺ کو جب اپنی حاجت کے مطابق وحی کی ضرورت ہوتی تھی تو وہ حالت نوم میں چلے جاتے تھے۔ کثرت ازدواج کے مسئلہ کو بھی وہ شہوت پرستی کے طور پر پیش کرتا ہے: "اس نے بعل سے ماہونڈ اور عائشہ کے مابین ہونیوالے جھگڑے کا تذکرہ کیا......'وہ عورت اس بات کو ذرا بھی برداشت نہ کر سکتی تھی کہ اس کا شوہر اتنی مزید عورتیں چاہتا ہے'، اس نے کہا 'اس نے ضرورت، سیاسی اتحاد اور دیگر امور پر باتیں کیں، لیکن وہ اس کو بیوقوف نہ بنا سکا۔ اس کو کون ذمہ دار ٹھہرا سکتا ہے؟ بالآخر وہ اس میں چلا گیا۔ کس میں چلا گیا؟ اپنی حالت نوم میں، اور جبرائیل سے ایک پیغام لیکر واپس آ گیا۔ جبرائیل نے ان آیات کی تلاوت کی جس میں اسکی تائید کی گئی تھی۔ خدا کی اپنی اجازت کہ وہ جتنی عورتوں سے مرضی چاہے ہم بستری

کرسکتا ہے؟ کیا تمہیں پتہ ہے اس عورت نے کیا کہا؟ یہ کہا، جب تمہیں کسی گڑ بڑ والے معاملے کو سنوارنا ہوتا ہے تو تمہارا خدا فوراً آن وارد ہوتا ہے۔" (صفحہ 386)

اس سے اگلے پیراگراف میں رشدی ایک اور واقعہ کو پیش کرتا ہے جو آنحضور ﷺ اور حضرت عائشہؓ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس واقعہ کے بیان کرنیکا مقصد یہ تھا کہ وہ ہتک آمیز زبان میں اس واقعہ کو گمراہ کن طریق سے پیش کر سکے۔ یہ وہ واقعہ ہے جس میں بعض شرارت پسندوں نے حضرت عائشہؓ کے پاکیزہ کردار پر داغ لگانے کی کوشش کی تھی۔ خدا کی طرف سے آنیوالی وحی سے یہ معاملہ سدھر گیا اور حضرت عائشہؓ اس الزام سے بری ہو گئیں۔ رشدی نے اس واقعہ کا انتخاب بھی کسی کے جذبات کا خیال رکھے بغیر، ٹھٹھا کرنے کیلئے کیا ہے:

" آؤ اس کے علاوہ ایک اور بات بتا تا ہوں، شہر کی گرما گرم خبر، واہ واہ، صحرا میں دونو جوان افراد کئی گھنٹوں تک اکیلے تھے اور اس بات کی طرف اشارہ بلند آواز میں لوگ کر رہے تھے کہ صفوان بہت ہی من چلا خوبصورت نو جوان تھا جبکہ پیغمبر اس جوان عورت سے عمر میں کافی بڑا تھا، اور کیا یہ ممکن نہ تھا کہ وہ عورت اپنی عمر کے برابر شخص کے لئے کشش رکھتی تھی؟ اب ماہونڈ کیا کرے گا؟ بعل یہ جاننا چاہتا تھا۔ اس نے پھر کر دکھایا، سلمان نے جواب دیا، 'پہلے کی طرح اس نے اپنے پالتو بڑے فرشتے کو دیکھا اور سب سے کہہ دیا کہ جبرائیل نے عائشہ کو بری الذمہ قرار دے دیا ہے۔' سلمان نے دست برداری کے رنگ میں اپنے بازو پھیلا دئے۔ اور اس بار جناب اس خاتون نے عین موقعہ پر نازل ہونیوالی آیات کے بارہ میں شکایت نہ کی"۔ (صفحات 386/387)

نبی آخر الزماں ﷺ کی وفات کے معاملہ میں بھی رشدی نے کہیں سے تاریخی واقعات تراش لئے ہیں اور اپنی ہوس پرست طرزِ تحریر جعلی واقعات کے ساتھ اس لئے استعمال کی ہے تا وہ 'سٹینک ورسز' کا موضوع پھر الّات کے لبادہ میں زیر بحث لا سکے۔ وہ اس خیال کو تقویت دینا چاہتا ہے کہ سرور کائنات ﷺ اپنی وفات کے وقت تین دیویوں سے متاثر تھے جس بناء پر ان کی رسالت کے آغاز میں اس قدر تنازعات پیدا ہوئے تھے۔ رسول اللہ کی وفات کا تذکرہ وہ ان الفاظ میں کرتا ہے:

"ایک گھنٹہ کے اندر یہ خبر لوگوں تک پہنچ گئی کہ پیغمبر، یعنی ماہونڈ، خطرناک مرض کا شکار ہو گیا

تھا، یہ کہ وہ عائشہ کے بستر میں دراز تھا اوراس کا سر یوں پھٹ رہا تھا گویا اس کے اندر بھوت پریت بھرے ہوئے ہوں...... پھر وہ بہت روئی یہ جانتے ہوئے کہ وہ اس کی موت کا ذکر کر رہی تھی، اس موقعہ پر اس کی آنکھیں اس کو دیکھتے ہوئے گزر گئیں اور کمرے میں موجود ایک اور شخص پر رک گئیں ...... یہاں کون ہے؟ اس نے آواز لگائی۔ کیا یہ تم ہو عزرائیل؟ لیکن عائشہ نے ایک مدھر آواز سنی جو عورت کی تھی جس نے جواب میں کہا: نہیں اے الاّت کے رسول، یہ عزرائیل نہیں ہے۔ پھر قندیل بجھ گئی اور اندھیرے میں ماہونڈ نے استفسار کیا: کیا یہ بیماری اے الاّت تو نے مجھے دی ہے؟ اس عورت نے جواب میں کہا: یہ میرا انتقام ہے اور میں مطمئن ہوں، ان کو اونٹ کی ٹانگ کی موٹی رگ کاٹنے دو، اور تمہاری قبر پر رکھنے دو۔ پھر وہ عورت باہر گئی اور وہ قندیل جو بجھ گئی تھی ایک بار پھر بڑی پرسکون روشنی دینے لگی، اب پیغمبر نے سرگوشی کی: 'اس کے باوجود اے الاّت اس تحفے کیلئے میں تیرا ممنون ہوں'۔ (صفحات 393/394)

اس نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ معاذ اللہ نبی کریم ﷺ زندگی کے آخری لمحات میں شیطانی خیالات کا شکار ہو گئے تھے۔ کیا یہ ایسے شخص کے خیالات ہو سکتے ہیں جس نے ساری زندگی خدا کی وحدانیت کا اس یقین محکم کے ساتھ پرچار کیا جس کی نظیر نہیں ملتی؟ رشدی ضرور احمقانہ تصوراتی دنیا میں رہ رہا ہوگا کہ وہ اس قسم کے مضحکہ خیز اور جعلی دعوے کرتا ہے۔ اس نے اس معاملے کو افسانوی کہہ کر پیش کرنے کی جو کوشش کی ہے اس سے وہ کسی کو بیوقوف نہیں بنا سکا۔ یہ اسلام اور ہر وہ چیز جس کا اسلام سے ذرا بھی تعلق ہے اس پر سوچا سمجھا اور پہلے سے تیار کردہ حملہ ہے۔ اس کا واحد مقصد یہی تھا کہ پوری دنیا کے مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کیا جائے۔ سلمان رشدی ایک تنہا فرد کی حیثیت سے اس منصوبے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا اور نہ ہی وہ قدامت پسند مسلمانوں کے دبے ہوئے جذبات کو مشتعل کرنیکا خطرہ مول لے سکتا تھا۔ ہاں اس کے بدلے اگر اس کو اتنی دولت دی جاتی کہ جسے وہ بمشکل سنبھال سکتا اور اتنی شہرت دی جاتی جس سے وہ آسانی سے جی سکتا نیز حالات کے دگرگوں ہونے کی صورت میں اسے مکمل حفاظت کا وعدہ کیا جاتا تو وہ ضرور ایسا کر لیتا۔

'دی سٹینک ورسز' کی اشاعت کے بعد ہونے والے ردعمل پر ایک نگاہ ڈالنا دلچسپی سے

خالی نہ ہو گا ۔ اس کے بعد فتویٰ کا اجراء ، رشدی کی طرف سے ہونے والی تو جیہات اور عذر خواہیاں، اور مغربی ذرائع اطلاعات میں اسلام کے خلاف مہم کا جاری رہنا، ان سب کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ لیکن پہلے میں کلمہ تکفیر اور کتابوں کے نذر آتش کئے جانے کے مسئلہ کو زیر بحث لاؤں گا جو 'رشدی افیئر ' کی وجہ سے لوگوں کے دماغوں میں ابھرے ہیں ۔ اس سے قاری کو یہ بخوبی علم ہو جائیگا کہ مسلمانوں کے شدید ردعمل کی اصل وجہ کیا تھی ۔

چودھواں باب

ہتک خدا، ارتداد اور الحاد

برطانیہ میں بریڈ فورڈ (یارک شائر) کے شہر میں 'دی سٹینک ورسز' کی چند کا پیوں کو نذر آتش کئے جانے کے واقعہ کو برطانیہ کے بڑے بڑے اخبارات نے جلی سرخیوں کیساتھ شائع کیا۔ ٹیلی ویژن پر بھی یہ خبر جامع رنگ میں دکھائی گئی۔ چند غصیلے مسلمانوں کے اس ردعمل کو تمام مسلمانوں کا ردعمل کہہ کر پیش کیا گیا، جس طرح اس واقعہ کو برطانوی ذرائع ابلاغ نے اچھالا اس سے اسلام اور مغرب کے درمیان تفرقات کی خلیج اور بھی بڑھ گئی۔

سب سے پہلے میں یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اسلام چند ایک مسلمانوں کے اس فعل کی ہرگز چشم پوشی نہیں کرتا جنہوں نے اپنے غصہ کو رفع کرنے اور رسوائے زمانہ ناول کے مندرجات پر بیزاری کا اظہار کرنے کیلئے کتابوں کو جلایا۔ اس ہنگامہ خیز واقعہ سے کسی قسم کا جسمانی تشدد وقوع پذیر نہ ہوا لیکن مغربی ذرائع ابلاغ رائی سے پہاڑ بنانے پر تلے ہوئے تھے۔ تاہم جو بات مغربی ذرائع ابلاغ نے آسانی سے فراموش کر دینے میں مصلحت جانی وہ یہ ہے کہ عیسائیوں نے خود ازمنہ وسطیٰ سے لے کر اب تک تاریخ میں کتنی کتابیں نذر آتش کی ہیں۔ چرچ کی شروع ہی سے یہ پالیسی رہی کہ مدمقابل مذاہب (یہودیت اور اسلام) سے عیسائیوں کو محفوظ کرنے کیلئے ان پر من گھڑت جھوٹے الزامات عائد کر دئے جائیں۔

ہانس کنگ (Hans Kung) جو جرمنی کی یونیورسٹی آف توبنگن میں پروفیسر ہے وہ اپنی کتاب میں لکھتا ہے: "ازمنہ وسطیٰ میں ...... یورپین اقوام عرب تہذیب، فلاسفی، سائنس، طب، اسلام کی اقتصادی اور فوجی طاقت کو بہ نظر استحسان دیکھتی تھیں......تاہم نشاۃ ثانیہ کے بعد ہر وہ چیز جو عرب تھی بشمول ان کی زبان کے اس کو حقیر سمجھا جانے لگا ...... کیونکہ اس وقت عیسائیت کو (1529ء) ترک قوم کی طرف سے فوجی خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ جب وینس میں، جو اس وقت ترکوں

کی طوائف کا شہر کہلاتا تھا، قرآن کی عربی زبان میں طباعت مکمل ہوئی تو پاپائے اعظم نے اس کو فوراً نذر آتش کر دینے کا فرمان جاری کر دیا۔ ایڈرین ریلینڈ (Adrian Reland) کی کتاب *De Religione Mohammedica* (دی ریلیجین آف محمدؐ۔ 1705ء) جو راس (Ross) کی کتاب *Pansebeia* کے بعد اسلام پر سب سے زیادہ حقیقت پسند کتاب تھی، اس کو ممنوعہ کتابوں کی فہرست رومن انڈیکس میں شامل کر دیا گیا تھا"

(Hans Kung, *Christianity & the World Religions*, page 20)

یہودی بھی عیسائیوں کے ظلم واستبداد کا نشانہ بنے کیونکہ یہودیوں کے ہتک خدا اور رسول کے جواب میں ان کی کتابوں کا جلا دینا بھی اس سازش کا حصہ تھا۔ چرچ کے نزدیک یہ معاملہ بہت ہی سنجیدہ تھا اور یہودیوں نے اپنی مقدس کتابوں کی بے حرمتی کے خلاف بہت آہ وفغاں کی۔ اس موضوع پر پروفیسر لیز ڈلیوی (Leonard Levy) نے اپنی کتاب میں مزید روشنی ان الفاظ میں ڈالی ہے: "پوپ گریگوری نہم نے فرمان جاری کیا کہ طالمود کو پوری عیسائی دنیا میں آگ کی نذر کر دیا جائے کیونکہ اس میں عیسیٰ اور مریم کے خلاف ہتک وکفر کے کلمات شامل تھے......لوئیس نہم (Louis IX) کو طالمود نذر آتش کر دینے میں مسرت حاصل ہوتی تھی...... پیرس میں 1248ء میں ان کا ایک ڈھیر نذر آتش کیا گیا......آراگان میں جہاں طالمود کو جلایا تو نہ گیا مگر اس کو ضبط کر کے اس میں سے نامناسب حصے حذف کر دئے گئے......کلمات کفر ادا کرنے کی سزا کے طور پر یہودیوں کو حکم تھا کہ وہ اپنی تمام کتابیں سرکار کے حوالے کر دیں، حکم عدولی کی سزا موت تھی......1550ء کی دہائی میں اطالین شہروں میں یہودی کتابیں اور نادر ربانی مسودات کو ہزاروں کی تعداد میں جلایا گیا......ایک اطالین کارڈینل نے 1629ء میں یہ ڈینگ ماری کہ اس نے دس ہزار یہودی کتابیں ضائع کر دینے کیلئے جمع کی تھیں۔"

(Leonard Levy, *Treason Against God*, page 116/117)

ایک اور مصنف ریورنڈ آئی بی پرانےٹس (Rev I.B. Pranaitis) نے بھی اسی قسم کی حکایات کا ذکر اپنی کتاب میں کیا ہے جو یہودیوں کی فقہ میں عیسائیوں کے بارہ میں خفیہ تعلیمات کے متعلق ہے: "شہنشاہ جسٹینین (Justinian) نے 553ء میں پوری رومی سلطنت میں طالمودی کتابوں کی ترسیل پر پابندی لگا دی۔ تیرھویں صدی میں دو پاپائے اعظموں یعنی گریگوری نہم

اور انو سینٹ چہارم نے طالمود کی کتابوں کو قابل مذمت قرار دیا کیونکہ ان میں عیسائی مذہب کے خلاف ہر قسم کی خباثت اور مذمت دین موجود تھی۔ انہوں نے ان کے جلا دینے کا حکم صادر کیا کیونکہ یہ مسیحی مذہب کیخلاف مکروہ باتوں کا پرچار کرتی تھیں۔"

(*The Talmud Unmasked*, page 21)

ان تاریخی حقائق کے پیش نظر کیا اب مغربی اقوام کیلئے یہ بات سمجھنا آسان ہوگئی ہے کہ مسلمانوں میں سلمان رشدی کے ناول 'دی سٹینک ورسز' میں آنحضور ﷺ کی پیش کردہ تصویر کے خلاف کیوں شدید ردعمل ہوا تھا۔ کیا اب ان کو یقین آ گیا ہے کہ ایک ناول اس قدر نفرت اور عداوت کو کیسے ہوا دے سکتا ہے؟ کیا مغرب کے عوام کے خدشے دور ہو گئے ہیں کہ مسلمان طبقے اپنے شہروں میں بیگانی اقدار کے مطابق نہیں رہتے اور نہ ہی یہ کہ وہ ان اقدار کے دفاع میں اپنی جانیں نچھاور کرنے کو تیار ہیں؟

ان زیرک لوگوں کو جو تاریخی حقائق سے شناسائی رکھتے ہیں، اس دردناک واقعہ نے یورپ کو اپنے ماضی کی یاد دلا کر بے چین کر دیا ہوگا۔ مزید یہ کہ عوام کو بالکل اندھیرے میں رکھا گیا اس لئے جب انہوں نے بریڈفورڈ کے مسلمانوں کو اس ناول کو نذر آتش کرتے دیکھا تو وہ اس کتابوں کے ڈھیروں کے آلاؤ سے اس کا ناطہ نہ جوڑ سکے جو صدیوں تک عیسائی یورپ میں بھڑکتا رہا۔ ہاں انہوں نے اس چیز کو اسلام کی ناقابل علاج غیر رواداری کے ثبوت کے طور پر پیش کیا، ایک ایسی غلط تصویر جو صدیوں سے یہ لوگ پیش کرتے آئے ہیں۔

عوام الناس خاص طور پر برطانوی بہت ہی انصاف پسند لوگ ہیں۔ جب ان کے سامنے معقول رنگ میں دلائل پیش کئے جاتے ہیں تو وہ غیر جانبدارانہ رنگ میں انصاف کیساتھ فیصلہ کرتے ہیں۔ لیکن اگر حقائق کو تعصب کی عینک لگا کر، نفرت کے بھیس میں چھپا کر پیش کیا جائے جیسا کہ مغرب کے ذرائع ابلاغ کی اکثریت کی یہ عادت ہے، تو پھر یہ حیرانگی کی بات نہیں کہ عوام الناس کی رائے ان لوگوں کے مطابق ہو جاتی جو اس طاقتور ذریعہ ابلاغ کو کنٹرول کرتے ہیں۔

ہتک خدا ورسول اور آزادی تقریر

ہتک خدا ورسول اور توہین آمیز کتابوں کے نذر آتش کئے جانے میں ایک نا قابل انکار تعلق ہے۔ رشدی افیئر نے یقیناً ان دونوں باتوں کو بھڑکایا ہے۔ اس کے نتیجہ میں ایک اور بہت اہم مسئلہ پیدا ہو گیا جو آزادی تقریر سے تعلق رکھتا ہے۔ اس حصہ میں ہتک خدا ورسول سے پیدا ہونے والے اولین واقعات بمع مثالوں کے پیش کر کے ان پر تبصرہ کیا جائیگا۔ ان کا تعلق ہمارے دور میں ہونیوالے واقعات سے جوڑا جائیگا۔ اس مسئلہ پر صحیح اسلامی تعلیمات کیا ہیں وہ پیش کی جائینگی۔

تاریخی طور پر انگریزی لفظ 'بلاسفیمی' (Blasphemy) بطور لقب کے استعمال ہوتا تھا یعنی دین کے مقدس معاملات میں ایسی غلط رائے دینا جو اختلاف کرنے والے کے نزدیک قابل اعتراض ہو۔ معترض صدق دل سے محسوس کرے کہ اس کے ایمان پر حملہ کیا گیا ہے درآنحالیکہ ہتک صرف اس کے ذہن میں ہی واقع ہوئی ہو نہ کہ قصوروار کے ذہن میں۔

بائبل کی تعلیمات

بائبل صاف اور غیر مبہم الفاظ میں اللہ کی شان میں بے ادبی کرنے کی مذمت کرتی ہے۔ یہ کلمہ کفر بکنے والوں کیلئے موت کی سزا مقرر کرتی ہے۔ یہود و نصاریٰ کی تاریخ میں Leviticus 24:16 نے کلمہ کفر کی سزا موت مقرر کر کے آنیوالی نسلوں کیلئے مثال قائم کر دی: 'وہ شخص جو اللہ کے نام کی ہتک کرے گا اسے موت دی جائیگی، حاضرین مجلس اس پر سنگساری کریں گے، عارضی شہری اور مقامی شہری بھی، جب وہ خدا کے نام کی ہتک کرے گا موت کی گھاٹ اتارا جائیگا'۔

ہتک خدا ورسول کے قوانین کی چرچ کی طرف سے باریک بینی سے پیروی کے نتیجہ میں یہودیوں کو صدیوں تک نشانہ ستم بنایا گیا۔ تاہم کوئی اس فرمان کی زد سے باہر نہ تھا بشمول خود عیسائیوں کے۔ اس کی ایک طنزیہ مثال اطالین نشاۃ ثانیہ کے فلاسفر جیورڈانو برونو (Giordano Bruno) کی ہے جو سولہویں صدی میں رہتا تھا۔ اس کے مقدمہ کی تفصیل سلمان رشدی کی حالت زار کی طرح نہایت دلچسپ ہے۔

رشدی سے موازنہ

برونو کے مقدمہ کی رشدی کے ساتھ بھیانک طور پر مشابہت پائی جاتی ہے جہاں تک حدود کی قیود کے بغیر ادبی اسلوب بیان کا معاملہ ہے۔ رشدی اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ اس کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار آزادی سے کرے چاہے وہ کس قدر متنازعہ ہی کیوں نہ ہوں۔ رشدی برونو کی طرح ہی روپوش ہوا تھا۔

جیوڈارنو برونو نہ تو سائنسدان تھا اور نہ ہی عالم دین، ہاں اس نے سائنس اور مذہب میں مفاہمت پیدا کرنے کی کوشش کی، لیکن اس کی فلاسفی نے دین کے بنیادی اصولوں کو تہ و بالا کر دیا۔ اس نے اپنے بارہ میں کہا کہ "اُس نے انسانی روح کو اور علم کو بھی آزاد کر دیا ہے۔ قید خانے کی بند ہوا میں اس کا دم گھٹ رہا تھا، جب اس نے دور ستاروں پر نگاہ ڈالی"۔
(Giordano Bruno, *Ash Wednesday Supper*, 1584)

رشدی نے افسانے اور مذہب کو آپس میں ملانے کی کوشش کی اور اس کے فلسفہ نے بھی اسلامی عقائد کو مسخ کر دیا۔ اس نے بھی آزادی تقریر کی پورے جوش سے پشت پناہی کی۔ برونو مذہبی تعلیمات سے بدکتا تھا کیونکہ اس کو دینی فرائض سے نفرت تھی۔ جب وہ اٹھارہ سال کی عمر کا تھا تو اس نے تثلیث کے بارہ میں شبہ کا اظہار کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کو مذہبی نشانات و علامات سے نفرت تھی خاص کر عیسائی بزرگوں کی تصاویر سے۔ خدا کا تین ہونا اس کے فہم و ادراک سے باہر تھا اور نہ ہی وہ خدا کا انسانی روپ میں ظاہر ہونا تسلیم کرتا تھا۔ جب ڈومینیکن فرقہ والوں نے اس کے خلاف تکفیر کا مقدمہ دائر کر دیا تو وہ وہاں سے فرار ہو کر نیپلز چلا گیا۔ اس نے اپنا عیسائی راہبوں والا نام تبدیل کر لیا اور مذہبی اطوار کو بھی خیر باد کہہ دیا۔ لیکن وہ خود کو غور و فکر کرنے والی دانشوری کی عادت سے آزاد نہ کر سکا۔ وہ کہتا تھا کہ مجھے اپنے فلسفہ کا آزادی سے اظہار کرنے کا حق حاصل ہے اور اس نے اس کا استعمال بھی جی بھر کر کیا۔

رشدی کی داستان بھی برونو سے کس قدر مشابہت رکھتی ہے! اس کا تعلق بھی ایک مسلمان گھرانے سے تھا لیکن بچپن سے ہی وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ اسلامی اصول و ضوابط اس کی جان پر بھاری بوجھ کی طرح تھے۔ اس کا ثبوت اس کی اولین کتابوں سے ملتا ہے۔ اس نے دین کی

قیود وضوابط پر اظہار خیال کیا اور اس بات کا دعویٰ کیا کہ اس کو مکمل آزادی کے ساتھ اپنے خیالات بیان کرنے کا حق حاصل ہے۔

جلاوطنی میں برونو مغربی یورپ کے شہروں میں در بدر پھرتا رہا جہاں وہ کبھی درس وتدریس اور کبھی کتابیں لکھنے میں مشغول رہا۔ اس نے یکے بعد دیگرے کتابیں تصنیف کیں۔ اس پر عزت افزائیاں نچھاور کی جانے لگیں۔حتیٰ کہ فرانس کے بادشاہ نے اس کو ذاتی طور پر فلاسفی کے لیکچرار کی ملازمت کی پیش کش کی۔اس کے بعد وہ لندن، آکسفورڈ، پراگ، زیورک اور فرینکفرٹ میں لیکچر دیتا رہا۔ رشدی کا بھی یہی حال ہے۔ جلاوطنی کے دوران وہ بھی یورپ میں گھومتا رہا اور ہر کس و ناکس کے پاس ہمدردی لینے کیلئے گیا۔ وہ ابھی بھی یکے بعد دیگرے کتابیں لکھ رہا اور لیکچر دے رہا ہے۔اس کو بھی لٹریری ایوارڈ اس کے خیر خواہوں نے درجنوں میں دئے ہیں۔

برونو کے نظریات اور اس کے ارسطوازم پر جارحانہ حملوں نے اس کو چرچ کے مدمقابل لا کھڑا کیا۔ اس کے متنازع خیالات نے بائبل کو مسترد قرار دیا مگر اس کے باوجود وہ نزاعی کتابیں تصنیف کرنے میں مصروف رہا۔ بالآخر وہ کیتھولک فرقہ کی مذہبی عدالت (Inquisition) کے سرکردہ افراد کے ہتھے (ہاتھ) چڑھ گیا جب 1592ء میں وہ اٹلی واپس لوٹا۔ اس پر ہتک خدا ورسول کا الزام عائد کیا گیا۔ پہلے تو اس نے اپنا دفاع پوری جاں بازی سے کیا اور ہتک خدا ورسول اور الحادی غلطیوں کے الزامات سے خود کو بری قرار دیا۔اس نے اپنے فلسفہ کے بارے میں آزادیٔ اظہار خیال کا سہارا لیتے ہوئے فطرت کے قوانین کے مطابق دلائل دینے کی کوشش کی۔ البتہ اس نے اس امر کا اعتراف کیا کہ اس کی فلاسفی الہامی صداقت سے میل نہ کھاتی ہو لیکن اس کا مقصد ہرگز مذہب کی تردید کرنا نہ تھا۔ آخر کار اُس کے معاملہ میں تحقیقات کرنے والے افسران نے اس کو مجبور کیا کہ گھٹنوں کے بل جھک کر عدالت سے رحم کی درخواست کرے: "ہولی چرچ کے احکامات اور کیتھولک مذہب کے خلاف میں نے جو فاش غلطیاں کی ہیں میں ان کو قابل مذمت سمجھتا ہوں۔ میں ہر وہ چیز جس کا کیتھولک چرچ سے تعلق ہے اس کو شک کی نگاہ سے دیکھنے پر توبہ کرتا ہوں۔"

(Quotations from Boulting, Bruno, pp 276/277)

اس کی ان التجاؤں کے باوجود کسی کے سر پر جوں تک نہ رینگی اور برونو قید میں ہی رہا۔

سلمان رشدی کی اذیت ناک داستان بھی اس سے بہت مشابہت رکھتی ہے۔ اس کے ناول نے اس کو مسلمان علماء کے مدمقابل لا کھڑا کیا۔ اس پر ہتک خدا و رسول اور کفر کے الزامات عائد کئے گئے۔ جب لوگوں نے اس کے متنازع ناول کی اشاعت کے بعد اس کا سامنا کیا تو اس نے اپنے قبیح فعل کا پوری قوت کے ساتھ دفاع کیا۔ اس نے آزادی تقریر کے حق کا سہارا لیا تاہم اس نے یہ بھی کہا کہ اس کا مقصود نہ تو اسلام اور نہ ہی حضور نبی پاک ﷺ کی اہانت کرنا تھا۔ اس کے بعد رشدی نے توبہ کا اعلان کیا اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ اسے حلقہ بگوش اسلام سمجھا جائے۔ لیکن اس کے باوجود جب فتویٰ کا حکم منسوخ نہ کیا گیا تو اس نے ایک بار پھر اپنے ناول کا دفاع شروع کر دیا۔ بلکہ پہلے سے بڑھ کر ادیبوں کے حقوق کا دفاع کرنے لگا۔

برونو کو بعد میں وینس سے روم منتقل کر دیا گیا کیونکہ مذہبی عدالت کے افسر اعلیٰ نے کہا کہ برونو کوئی عام سا ملحد نہ تھا، اس کو ملحدوں کا سرغنہ قرار دیا گیا بلکہ الحاد کو شروع کرنے والا۔ روم کی مذہبی عدالت کی کال کوٹھڑی میں اس کو سات سال تک قید رکھا گیا۔ اس پر الحاد کے مزید الزامات عائد کئے گئے۔ جب آخری بار اس سے پوچھ گچھ کی گئی تو اس نے اعلان کر دیا کہ وہ اپنے گمراہ کن عقائد سے دست بردار ہو جائیگا۔ اس کو سولی پر چڑھا کر نذر آتش کئے جانیکی سزا سنائی گئی جس پر عملدرآمد 17 فروری 1600ء کو کیا گیا۔

(Leonard Levy, *Treason against God*, pp. 152/155)

رشدی نے بھی ایک بار پھر پبلک کے سامنے کھل کر آنے کی ہمت کی۔ سات سال کی روپوشی کی زندگی سے جب وہ تنگ آ گیا تو ستمبر 1995ء میں اپنے نئے ناول *The Moor's Last Sigh* کے افتتاح کیلئے عوام کے سامنے آیا۔ اپنے گناہ پر نادم ہوئے بغیر اور اس کے باوجود کہ اُس پر لگائے گئے فتویٰ کا خطرہ ابھی تک اُس کے سر پر تھا۔ بعض لوگوں کے نزدیک یہ رشدی کی جرأت مندانہ حرکت تھی اور بعض کے نزدیک حماقت۔ بہرحال یہ تو آنے والا وقت ہی بتلائے گا۔

ہتک خدا و رسول کے جرم میں برطانیہ میں آخری بار پھانسی سکاٹش قانون کے تحت

1697ء میں دی گئی تھی۔ برطانوی پارلیمنٹ نے اگلے سال 1698ء میں ہتک خدا اور رسول کے متعلق ایک نیا قانون پاس کیا جس کے تحت سزائیں کم کر دی گئیں۔ اگلی صدی میں مذہب سے متعلق آزادی تقریر میں ایک نئے عہد کا دور شروع ہوا۔ اس کے بعد ہتک خدا اور رسول کے قانون کی خلاف ورزی کرنے والے زیادہ تر آزاد خیال، عقلیت پسند، لا ادریے، اور دہریے تھے۔ اپنے عقائد کے دفاع میں یہ لوگ اب پریس کی آزادی اور آزادیٔ مذہب پر انحصار کرنے لگے تھے۔

ہتک خدا و رسول کا قانون بیسویں صدی میں

بیسویں صدی اگر چہ مذہب پر اعتقاد کے لحاظ سے اتنی اہم نہ تھی جتنی کہ اس لحاظ سے کہ جادوگرنیوں، ہتک خدا اور رسول کرنیوالوں، اور ملحدوں کو آگ کی نذر کر دیا جاتا تھا۔ لیکن اس صدی کے شروع میں ہتک خدا اور رسول قابل تعزیر تھے اور اس کی سزا قید تھی۔ عیسائی دنیا میں 1920ء اور 1930ء کی دہائیوں میں ہتک خدا و رسول کے بہت سارے واقعات وقوع پذیر ہوئے۔ مثلاً برطانیہ میں ایک ہتک خدا اور رسول کرنیوالے منکر دین کو اس لئے جیل میں ڈال دیا گیا کیونکہ اس نے انجیل کے خلاف بدترین مغلظات بکی تھیں۔ خاص طور پر یسوع مسیح کے بارہ میں اس کا کہنا کہ وہ یروشلم یوں داخل ہو رہا تھا: "جیسے وہ سرکس کا دو گدھوں پر بیٹھا مسخرہ ہو"

(Rex v. Gott, 16 Crim. App. Rep. 37; 1922)

امریکہ کی ریاست مین (Maine) نے ایک انتہا پسند کو اس لئے قید کی سزا دی کیونکہ اس نے دین کا انکار ہتک آمیز رنگ میں کیا تھا۔ وہ بن باپ پیدائش اور خدا کے تجسّم (Incarnation) کے عقائد کا منکر تھا۔ (State v. Mockus, 120 Maine 84, 1921)۔ اسی طرح میساچوسٹس (Massachusetts) کی ریاست نے ایک شخص پر اسلئے مقدمہ دائر کر دیا کیونکہ وہ خدا کی ہستی اور یسوع مسیح کی الوہیت کا منکر تھا۔ اسی ریاست میں ایک مصنف جس نے فری میسن پر کتاب لکھی اس میں اس نے یسوع مسیح کو بداخلاق لکھا تو اس کو قید خانے کی نظر کر دیا گیا۔ ایک اور امریکی ریاست ارکن سا (Arkansas) نے ایک انجمن 'امریکن ایسوسی ایشن فار دی ایڈوانسمنٹ آف اتھی ازم' (American Association for The advancement of Atheism) کے صدر کو اس لئے ملزم قرار دیا کیونکہ اس

نے بائبل کی تخلیق کی کہانی کا استہزاء کیا تھا۔

(*New York Times*, February 19, 1926)

کینیڈا میں ایک پمفلٹ جس میں رومن کیتھولک چرچ پر کڑی تنقید نیز اس میں ہتک خدا و رسول بھی کی گئی تھی اس کو قابل تعزیر سمجھا گیا۔ اور ایک اور معاملہ میں ایک دہریت کے رسالہ کے ایڈیٹر کو قید کر کے ملک بدر کر دیا گیا کیونکہ اس نے ایک مضمون میں 'جیہووا' Jehovah) (Witness مذہب کے بارہ میں ہنسی مذاق کے رنگ میں نا معقول حوالے دئے تھے۔ (Canadian Bar Rev; V, May 1927)۔ یہ بات دلچسپی سے نوٹ کرنے کے لائق ہے کہ کینیڈا کے 'جیہوا مقدمہ' میں ٹرائیل جج نے جیوری کو تاکید کی 'مذہب سے زیادہ ہمارے لئے کوئی اور چیز مقدس نہیں'، اس لئے کسی قسم کی بدزبانی، یا غیر معقول تحریر جو خدا سے ڈرنے والوں کے نزدیک قابل اعتراض ہے وہ ہتک خدا و رسول ہے۔

برطانیہ کے ملک میں بھی جہاں آزادی تقریر کی اتنی قدر کی جاتی ہے، عیسائیت ابھی تک ملک کا سرکاری مذہب ہے۔ تاہم یہاں یہودیت اور غیر نصرانی مذاہب کے بارہ میں کلمہ تکفیر بولا نہیں جا سکتا۔ 1978ء میں کورٹ آف اپیل نے ہتک خدا و رسول کے ایک مقدمہ میں سزا برقرار رکھی۔ اس مقدمہ میں مجرم کا نام جیمز کرکپ (J. Kirkup) تھا جو ایک غیر معروف ہر دو ہفتہ بعد شائع ہونیوالے جنسی رسالہ "گے نیوز" (*Gay News*) کا ایڈیٹر تھا۔ اس میں اس نے ایک نظم شائع کی (محبت جس کا نام زبان پر لانے کی جرأت نہیں The Love That Dares to Speak its Name) جو لگتا تھا کسی رومن سوسپاہیوں کے افسر نے صلیب کے سائے میں بیٹھ کر لکھی تھی۔ نظم میں اس افسر اور یسوع مسیح کو اغلام باز کے طور پر پیش کیا گیا اور دونوں کے درمیان مباشرت کے فعل کو بیان کرنے کیلئے ایسے فحش الفاظ استعمال میں لائے گئے جو ایمان لانے والوں کا دل دکھا دینے والے تھے۔

حیرانگی کی بات یہ ہے کہ جیمز کرکپ کو برطانیہ کے ممتاز اہل قلم اور نقادوں نے قابل احترام ادیب قرار دیا۔ اس کے مقدمہ کا سرکاری وکیل متعصب شخص نہ تھا اور اس نے لارڈ کولرج کے 1883ء کے قانون کو دوبارہ لکھے جانیکی درخواست کی، جو کچھ یوں ہے: "تم یہ کہہ سکتے ہو کہ یسوع

فراڈ یا دھوکہ باز تھا، یا کہ شاید یسوع اغلام باز تھا، بشرطیکہ یہ بات تم سلیقے سے کہو" (یہی چیز یقیناً رشدی پر لاگو ہوتی ہے)۔ سرکاری وکیل نے کہا کہ یہ نظم اس قدر خباثت کا مجموعہ تھی کہ ایک گمراہ کن خیالات رکھنے والا شخص بھی اس سے زیادہ گندی نظم نہیں لکھ سکتا تھا۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اولڈ بیلی (Old Bailey) میں مقدمہ کے جج نے نظم کے ادبی اوصاف کو بحیثیت شہادت قابل قبول ماننے سے انکار کر دیا، نہ ہی شاعر کی شہادت مانی اور جیوری نے قصوروار ہونے کی سزا کے علاوہ رسالہ کو ایک ہزار پاؤنڈز کا جرمانہ اور ایڈیٹر کو پانچ سو پاؤنڈز کا جو جرمانہ لگایا تھا اس کو مناسب سمجھا۔ جج نے ایڈیٹر کو نو مہینے کی قید کی سزا سنائی لیکن اپیل کی صورت میں یہ قید ملتوی کر دی گئی۔

(*The Times*, July 4 to July 12, 1977)

امید کی جاتی تھی کہ سلمان رشدی کے ناول *The Stanic Verses* کے خلاف بھی اس قسم کا عدالتی فیصلہ تجویز کیا جائیگا، لیکن اس کے برعکس ادبی دنیا نے خدا کی شان میں گستاخی کرنیوالے ناول پر تحسین کے ڈونگرے برسائے۔ اس پر متعدد ادبی ایوارڈ نچھاور کئے گئے اور مصنف کو ادبی حلقوں میں رجل عظیم کا مقام عطا کیا گیا۔ برطانیہ میں اسلام کے خلاف گستاخی کرنے والوں کو روکنے کے لئے کوئی قوانین نہیں ہیں اس لئے مصنف کیلیئے قید کی سزا شاید کچھ زیادہ ہی ہو لیکن مسئلہ کی نزاکت کے پیش نظر ناول کی اشاعت اور ترسیل پر پابندی لگانا تو ممکن تھا۔

1976ء کے اولمپک اور ورلڈ آئس سکیٹنگ چمپیئن جان کری (John Curry) کے متعلق شائع ہونیوالی ایک متنازع سوانح عمری کی مثال لیجئے جس کی وفات 1994ء میں ایڈز سے منسلکہ بیماری سے ہوئی۔ یہ ایچ آئی وی (HIV) کی بیماری اس کو ہم جنس ساتھی نے دی تھی۔ کتاب *Black Ice, the life and death of John Curry* میں اس کی مصنفہ ایلوا اوگلانبی (Elva Oglanby) دعویٰ کرتی ہے کہ جان کری ہم جنس رشتہ میں منسلک ہونے کے علاوہ، ڈرگز اور مائنڈ کنٹرول تھراپی میں بھی مبتلا تھا۔ جان کری کے خاندان نے کتاب میں دئے گئے اس کی تربیت سے متعلق الزامات کو پورے زور سے للکارا اور اس کے ایک بھائی مائیکل کری نے کہا کہ اس کتاب نے 'ہمارے خاندان کو بڑی ذہنی اذیت سے دوچار کیا ہے'۔

کتاب کے پبلشر وکٹر گولانز (Victor Gollancz) کے ایک ترجمان نے اس بات کی تصدیق کی کہ ہمارے پاس ایک شکایت آئی تھی جس کے نتیجہ میں ہم نے اس کتاب کی اشاعت التوا میں ڈال دی ہے۔ (*Times*, 28th March 1995)۔ پبلشر کی طرف سے مفاہمت کی یہ کتنی عمدہ مثال ہے کہ انہوں نے کتاب کی اشاعت اس لئے التوا میں ڈال دی کیونکہ اس طرح جان کری کے خاندان کے چند افراد کے جذبات مجروح ہوتے تھے۔ لیکن اس کے برعکس دنیا بھر میں بسنے والے کروڑ ہا مسلمانوں کے جذبات کا کیا کسی کو احساس ہے جو '*The Stanic Verses*' کی اشاعت کے بعد برے طور پر مجروح ہونے والے تھے۔ '*The Stanic Verses*' کے پبلشر اور مصنف دونوں کو اس کاری گھاؤ کا خوب علم تھا جو اس ناول نے اسلامی دنیا پر لگانا تھا اور اس کے نتائج اور ردّ عمل کا بھی۔

شاید اب وقت آ گیا ہے کہ ہتک خدا و رسول کے قوانین کا سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ کیا جائے، "ایک قانون جو صرف ایک مذہب کی حفاظت کرتا ہے اس کا کوئی مصرف نہیں"۔ محولہ بیان سرکاری وکیل جیفری رابرٹ سن کیوسی (G. Roberston QC) کا ہے جو لندن کے اخبار *The Times* میں 25 جولائی 1989ء کو شائع ہوا تھا۔ اس نے ایک اور دلچسپ نقطہ بیان کیا کہ 'رشدی کی اپنی شہادت عدالت میں قابل قبول نہ ہو گی کیونکہ 1979ء میں ہاؤس آف لارڈز نے 3:2 کے ووٹ سے یہ فیصلہ دیا کہ ہتک خدا و رسول کرنیوالے شخص کی نیت خارج از بحث ہو گی صرف اس سے پیدا ہونیوالے نتائج اہمیت رکھتے ہیں'۔ مسٹر رابرٹ سن نے مزید کہا کہ: 'ہتک عزت کے دعویٰ میں ادبی معیار کوئی قابل قبول دفاع نہیں ہوتا'۔ ہتک خدا و رسول سے متعلق موجودہ قوانین کو وہ ذمہ وار ٹھہراتا ہے: '(قوانین) اس قدر مبہم ہیں کہ کوئی شخص پہلے سے یہ بات ثابت نہیں کر سکتا کہ آیا کوئی کتاب قابل تعزیر ہو گی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہتک خدا و رسول کے قوانین دوسرے قوانین کے مقابلہ میں کمزور ہیں۔ 'ذرائع ابلاغ میں فحاشی اور بے حیائی پر عائد پابندیوں کی بھرمار جس کا مقصود مقدس اشیاء کا فحش نگاری کے طور پر اظہار، پبلک آرڈر قانون کے ماتحت دھمکی دینا، بے عزتی کرنا اور گالی گلوچ کے استعمال، یا ایسی تحریر جس سے امن ٹوٹنے کا خدشہ ہو، نیز دوسرے کئی ایک قوانین ایسے لوگوں کو سزا کا مستحق قرار دیتے ہیں جو مذہبی عبادات کی

خلاف ورزی کرتے ہوں۔'

یوں محسوس ہوتا ہے کہ بالعموم مسلمان اپنے مذہب سے کچھ زیادہ ہی دلی لگاؤ رکھتے ہیں۔ ایسا مذہب جو تمام انبیاء کرام پر ایمان لانا واجب قرار دیتا ہے۔اس لئے لازماً وہ انبیاء کے دفاع کیلئے جھٹ سے تیار ہو جاتے ہیں چاہے یہ محمد ﷺ ہوں یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام یا کوئی اور نبی۔اس کی بہترین مثال ایک فلم ' The Last Temptation of Christ' کی ریلیز تھی۔بعض کا کہنا تھا کہ کسی اور مذہبی گروہ کی نسبت مسلمان اس فلم کے خلاف احتجاج کرنے میں زیادہ جوشیلے تھے۔ یہ سچ ہی ہوگا مگر ایک اور بات جو دل کو لگتی ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان اپنے عقائد میں استقامت رکھتے ہیں اور یہ کہ وہ دوسرے ادیان کے رسولوں کا کما حقہ احترام کرتے ہیں۔ بہت ہی اچھا ہوگا اگر دونوں طرف سے اس قسم کے جذبات کا اظہار ہو۔مزید یہ کہ برطانیہ جو کہ ایک عیسائی ملک ہے اس نے اس فلم کے دکھائے جانے کی اجازت دی تھی۔اس امر سے عوام الناس کا رجحان مذہب کے بارہ میں واضح ہوتا ہے۔ یہ کوئی حیرانگی کی بات نہیں کہ ایسے لوگ مذہب سے منسلک معاملات میں مسلمانوں کے غصہ کا اندازہ بالکل نہیں کر سکتے۔

یہ کہنا مناسب ہوگا کہ دنیا میں عموماً اور برطانیہ میں خاص طور پر اخلاقی تنزل آنے سے لوگ چونکہ مذہب سے متنفر ہو کر دور ہو رہے ہیں اس کے نتیجہ میں ہتک خدا و رسول کے قانون کو لوگ فرسودہ اور ماضی کی یادقرار دینے لگے ہیں۔لیکن وہ ممالک اور ادیان جہاں مذہب ابھی بھی مرکزی حیثیت رکھتا ہے ہتک خدا اور رسول کا مسئلہ سنجیدگی کے ساتھ لیا جاتا ہے۔مغربی مبصرین لوگوں کے قوانین اور عقائد کی ہتک پر کیوں تلے ہوئے ہیں چاہے ان کو یہ عقائد کتنے ہی ظالمانہ اور فضول نظر آتے ہوں؟

مثال کے طور پر دو پاکستانی عیسائیوں کے مقدمہ کو لیجئے جن کو ہتک رسول کے قانون کی خلاف ورزی کرنے پر فروری 1995ء میں موت کی سزا سنائی گئی تھی۔ پوری دنیا میں یہ سنسنی خیز خبر جلی سرخیوں کے ساتھ پھیلائی گئی۔اس سے مغربی ذرائع ابلاغ کو ایک اور موقعہ مل گیا کہ وہ اسلام کو بربریت اور غیر انسانیت سے جوڑ دیں۔ دی ٹائمز اخبار کے رائیٹر برنارڈ لیوین (Bernard Levin) نے ایک بہت ہی نقصان دہ مضمون اس واقعہ پر لکھا جس کا عنوان دل فگار تھا: " دیوار پر

تصویر بنانے پر موت کی سزا۔ کیا اسلام اتنا کمزور مذہب ہے کہ خیالی کیچڑ اچھالنے پر بچوں کو قتل کر دیا جائے؟"

انسان حیرت کی تصویر بن جاتا ہے کہ The Times جیسے مؤقر اخبار نے اپنے ایک صحافی کو ایسا گزند دینے والا اور نقصان دہ مضمون لکھنے کی اجازت دی جس سے مشرق اور مغرب کے مابین تعلقات استوار ہونے میں کوئی فائدہ نہیں ہونا تھا۔ مثلاً اس کا یہ لکھنا کہ:"میں کسی اور مذہب کے بارہ میں نہیں جانتا جو مقابلہ کے خوف سے گھبراتا ہو۔ اور یہ بہت طنز آمیز بات ہے کہ ایسا مذہب جو سب سے زیادہ کمزور ہے...... وہ سب سے زیادہ ظالمانہ اشتعال انگیز اور جنونی ہے"۔ اس کا مضمون اس نفرت انگیز تنبیہ کے ساتھ ختم ہوتا ہے:" پاکستان کے خلاف تنفر اتنا گہرا اتنا دیرپا اور اتنا فیصلہ کن ہوگا کہ ان کے ملک کا نام تھوکنے کے بغیر کبھی سننے میں نہ آئیگا۔"
(*The Times*, 17 Feb. 1995)

برنارڈ لیوین جیسے صحافیوں کا شکریہ کہ یہ تنفر پاکستان اور خاص طور پر اسلام کے خلاف ایک جاری رہنے والا چکر ہے۔ آج کے ناقدین تو جلتی پر تیل پھینک رہے ہیں۔

ہتک خدا و رسول کے بارہ میں اسلامی تعلیمات

رشدی افیئر نے اخلاقی جرائم جیسے ہتک خدا اور رسول، ارتداد اور الحاد کے متعلق بعض بنیادی مسائل کھڑے کر دئے ہیں۔ مغرب میں اسلام کے بارہ میں آجکل یہ تصور پایا جاتا ہے کہ یہ تنگ نظر، غیر روادار اور بربریت پر مبنی مذہب ہے جو تلوار کی نوک پر تبدیلی مذہب کا پرچار کرتا اور ہتک خدا اور رسول کی سزا موت قرار دیتا ہے۔ لیکن جیسا کہ میں ابھی تفصیل سے واضح کرونگا یہ باتیں حقیقت سے کوسوں دور ہیں۔

آزادی تقریر اور آزادی ضمیر پر قرآن مجید میں ایک بھی ایسی آیت نہیں جو ان پر پابندی عائد کرتی ہو۔ ذاتی عقائد اور نظریات طریق زندگی اور کسی کے ذاتی عقیدہ کو نظر انداز کرتے ہوئے قرآن پاک ہر انسان کو مکمل بنیادی حقوق عطا کرتا ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے: لَا اِكْـرَاهَ فِـى الـدِّيْنِ (سورۃ البقرۃ۔ 2:257) یعنی، دین کے معاملہ میں کوئی جبر نہیں۔ اگرچہ بعض لوگوں نے اپنی غیر رواداری اور تنگ نظری کو اسلام سے منسوب کر دیا ہے، قرآن پاک سے موہوم سی شہادت

نہیں ملتی جس سے یہ ثابت کیا جاسکے کہ اسلام ہتک خدااور سول کیلئے یا ایسی دیگر واہیات باتوں کیلئے موت کی سزا تجویز کرتا ہے۔اس کے برعکس مسلمانوں کونصیحت کی گئی ہے کہ وہ مشرکین کے دیوتاؤں کونشانہ تضحیک نہ بنائیں۔ارشادربانی ہے: وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّو اللّٰهَ عَدْواً بِغَيْرِ عِلْمٍ (سورۃ الانعام۔6:109)،ترجمہ۔"اورتم ان کوگالیاں نہ دوجن کووہ اللہ کے سواپکارتے ہیں ورنہ دشمنی کرتے ہوئے بغیرعلم کے وہ اللہ کی شان میں گستاخی کریں گے"۔اور یہ اس امر کے باوجود ہے کہ بت پرستی سب سے قبیح گناہ ہے جوکوئی شخص کرسکتا ہے۔اس لئے مسلمانوں کواس بات کی اجازت ہی نہیں دی گئی کہ وہ خدا کی نگاہ میں سب سے غضب آلود چیز کو گالیاں دیں۔

قرآن حکیم جیسی اعلیٰ وارفع تعلیم کی مثال آج کے 'مہذب دور' میں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی ہے۔قرآن حکیم تو مسلمانوں کونصیحت کرتا ہے کہ وہ دوسروں کے مذہب کا احترام کریں جبکہ برطانوی کامن لاءاس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ ہرکوئی اپنے مذہب کا ہی احترام کرے۔اس کے باوجودلوگ اسلام پرہی الزام عائد کرتے ہیں کہ یہ پسماندہ ہے۔خدا کی شان میں گستاخی سے بڑی کوئی اورگستاخی ہونہیں سکتی۔اس کے باوجودقرآن ہتک خدا کے سنگین جرم کی کوئی سزامقرر نہیں کرتا اس لئے ہتک رسول کے لئے کیسے حدمقرر کی جاسکتی ہے۔انبیاءکرام محض فانی انسان تھے۔ محمد مصطفیٰ خاتم النبیین ﷺ کی زندگی کا ایک سبق آموز واقعہ اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ آپؐ کے نزدیک ہتک رسول کی کیا وقعت تھی۔

جب نبی پاک ﷺ مدینہ کے فرماں روا تھے تو آپؐ کی مبارک ذات کے خلاف ہتک کا ایک نہایت بہیمانہ واقعہ رونما ہوا۔ایک منافق جس کا نام عبداللہ ابن اُبیّ ابن سلول تھا۔اس کی عزیز ترین خواہش تھی کہ وہ مدینہ کا والی بن جائے مگر آپؐ کی آمد سے اس کی یہ خواہش ناکام ہوگئی۔ایک جنگی مہم کے دوران اُس نے یہ شیخی ماری کہ: لَئِنْ رَّجَعْنَا اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ (سورۃ المنافقون 63:9) ترجمہ۔"اگرہم مدینہ کی طرف لوٹیں گےتو ضرور وہ جو سب سے زیادہ معزز ہے اسے جوسب سے زیادہ ذلیل ہے اس میں سے نکال باہر کرے گا"۔ ابن ابی کی اس شیخی پرصحابہ کرام رضوان اللہ طیش میں آ گئے، بلکہ اس کا بیٹا جو کہ ایک مخلص مسلمان تھا

وہ تو آپے سے باہر ہو گیا۔ تلوار میان سے نکال اس نے حضور ﷺ سے التجا کی کہ وہ اسے اپنے باپ کو تہ تیغ کر دینے کی اجازت مرحمت فرمائیں۔ اس کے علاوہ دیگر مسلمان بھی آپؐ کے پاس آئے، لیکن آپؐ نے ہر ایک کو اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ بلکہ آپؐ نے بڑے اصرار سے فرمایا کہ عبداللہ کے خلاف کوئی سرزنش نہیں کی جائیگی۔

یہ قصہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ کئی سالوں بعد جب عبداللہ بن ابیؓ بن سلول کی وفات ہوئی تو خاتم المرسلین ﷺ اس کی تجہیز و تکفین میں بنفس نفیس شامل ہوئے۔ آنحضور ﷺ کی رحمدلی سے ہر کوئی واقف تھا اس کے باوجود آپؐ کے اس فعل نے آپ کے صحابہ کرامؓ کو بھی حیرت میں ڈال دیا۔ یہ وہ اصل اسلام ہے جس کی تعلیم قرآن مجید دیتا ہے اور جس کا عملی نمونہ حضور نبی پاک ﷺ نے پیش کیا ہے۔ آپؐ کے نیک نمونہ پر عمل پیرا ہونے کی ہر مسلمان کو تاکید کی جاتی ہے۔ کسی مذہب کا فیصلہ اس کے چند ایک انتہا پسند ماننے والوں کے اعمال اور خیالات سے نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کا فیصلہ مصدقہ ماخذوں سے کیا جانا چاہئے جن پر اس کی بنیاد ہے۔

کیا شمالی آئر لینڈ میں جو جدید زمانے کی کیتھولک اور پروٹسٹنٹ جنگ ہوئی تھی اس سے عیسائیت کے بارہ میں فیصلہ دیا جا سکتا ہے؟ یہ جنگ جو عیسائیت کے نام پر لڑی گئی تھی یا عہد وسطیٰ کے زمانے میں عیسائیوں کے بہیمانہ مظالم جو سپین کی مذہبی عدالت Spanish Inquisition نے سچائی اگلنے کیلئے وحشیانہ آلات جیسے ریک (Rack) اور آئرن میڈن (Iron Maiden) بے تکلف استعمال کئے۔ کیا یہ وہ عیسائیت تھی جس کا پرچار حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کیا تھا جو بذات خود ناقابل بیان اور شدید اذیت کا نشانہ بنے تھے؟

جملہ ادیان، اقوام اور برادریوں کے درمیان مفاہمت کیلئے کشادہ دلی سے رواداری، عقل سلیم اور دانشمندی کی ضرورت ہے۔ لیکن مغربی ذرائع ابلاغ کو رشدی افیئر اور امام خمینی کے فتویٰ جاری کرنے پر اسلام کے خلاف بغض وعناد کی آگ کو ہوا دینے کیلئے کھلی چھٹی مل گئی۔ یہ بات مختلف اخبارات کے آگے دئے جانے والے تراشوں سے ثابت ہو جائیگی۔

پندرھواں باب

رشدی کے خلاف فتویٰ اور مغربی ذرائع ابلاغ

رشدی کے خلاف جاری ہونیوالے فتویٰ کی پوری دنیا میں مذمت کی گئی اور یہ مناسب بھی تھا۔ ایران کے لیڈر آیت اللہ خمینی نے اس فتویٰ کے جاری کرنے کی اتھارٹی اپنے آپ ہی سے حاصل کی تھی نہ کہ قرآن سے۔ لیکن ذرائع ابلاغ کا رویہ اس بارہ میں بہت ہی تباہ کن رہا۔ اس مسئلہ کو اس رنگ میں پیش کیا گیا جس سے سادہ لوح مسلمان یہ تاثر محسوس کرنے لگے کہ مغرب کے تہذیب یافتہ معاشروں کے برعکس اسلام آزادی تقریر کی اجازت نہیں دیتا اور یہ کہ اسلام کے قوانین عہدوسطیٰ کے دور سے تعلق رکھتے اور آج کے دور میں ان کیلئے کوئی جگہ نہیں ہے۔

برطانیہ کے اخبار 'The Independent' کے ادریہ میں فتویٰ کو پرانے زمانے کا اور عہدوسطیٰ کے دور کا حکم قرار دیا گیا (15 فروری 1989ء)۔ اس مضمون میں یہ بھی تجویز کیا گیا کہ اسلام کے مقابلہ میں عیسائیت ہتک خدا ورسول کے قانون کے معاملہ میں وقت گزرنے کے ساتھ زیادہ روادار ہوگئی ہے اسلام کو بھی ایسا ہی کرنا چاہیئے۔ پھر مضمون یوں ختم ہوتا ہے: "ایک ملٹی کلچرل سوسائٹی (یعنی کہ برطانیہ) کو ان کے موقوف کر دینے کا سوچنا چاہیئے نہ کہ ہتک خدا ورسول کے قوانین کو مزید جاری رکھنے کا"۔ میرے خیال میں چونکہ عیسائی اس بات کو سنجیدگی سے نہیں لیتے اس کا مطلب یہ نہیں کہ مسلمانوں کو بھی ایسا ہی کرنا چاہیئے۔

اخبار دی ٹائمز کے مذہبی امور کے ایڈیٹر، کلفرڈ لانگ لی (Clifford Longley) نے اپنے مضمون 15/فروری 1989ء میں فتویٰ کے عہدوسطیٰ کے دور سے تعلق رکھنے کے دعویٰ کو دہرایا: "بیسویں صدی میں اسلام کے نظریات، تیرھویں اور چودھویں صدی کی عیسائیت سے زیادہ مختلف نہیں"۔

اخبارات کی اکثریت نے برطانیہ میں مقیم تشدد پسندوں کے نظریات پر زیادہ توجہ مرکوز کی

اور اس امر پر کہ یہ لوگ کیوں رشدی کے خون کے پیاسے ہو گئے ۔ جہاں تک مسلمانوں کے جذبات کا تعلق ہے اخبارات نے اس فعل کو طبعی قرار دیا ہے۔لیکن جیسا کہ اس سے پہلے واضح کیا گیا کہ یہ قدامت پسند نقطہ نظر ایک بہت چھوٹی اقلیت کا ہے۔ سچی بات دراصل یہ ہے کہ اخبارات میں جذبات کو اُبھارنے والی سرخیاں لگانے سے اور کتابوں کے جلائے جانے کی تصاویر شائع کرنے سے اخبارات دھڑا دھڑ بکتے ہیں۔مثلاً برطانیہ کے اخبار 'دی انڈی پینڈنٹ' کی 18 فروری 1989ء کی اشاعت میں ایک پورا صفحہ بریڈفورڈ کے نوجوان تشدد پسند مسلمانوں کے بیانات سے بھرا ہوا تھا۔اس کا عنوان تھا' مجاہد خون ریزی کرنے پر تلے ہوئے ہیں'۔لیکن ایسے مسلمان جنہوں نے رشدی پر قتل کے فتویٰ کی حمایت نہ کی تھی ان کے شائستہ اور معقول خیالات کو چھوٹے چھوٹے حروف میں اخبار کے آخر پر شائع کیا گیا۔

اخبار مذکور کے صحافی انٹونی برجس (Anthony Burgess) نے ایرانی فتویٰ کا موازنہ اسلام کے 'بدمعاش ٹولوں کی شاطرانہ چالوں' سے کیا۔اس نے اسلامی قوانین کی مذمّت کرنے میں موزوں الفاظ کے انتخاب کا خیال نہ رکھا۔ ہمارے نزدیک اس کو اپنے خیالات کے اظہار کا یقیناً حق حاصل ہے لیکن اس کے مضمون کے لب ولہجہ سے اسلام کے لئے شدید نفرت کی بو آتی ہے۔وہ لکھتا ہے:"ان کو (مسلمانوں کو) رشدی کی کتاب ضائع کر دینے کے بارہ میں بیانات دینے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔اگر ان کو ہماری غیر مذہبی سوسائٹی پسند نہیں تو ان کو آیت اللہ کی بانہوں میں چلے جانا چاہئے۔ یا کسی اور خودساختہ پاکباز کے پاس جو اسلامی اخلاق کا کڑا محافظ ہو۔" (16-2-1989)۔یوں لگتا ہے جیسے یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ مسلمان کسی دوسرے کرّہ سے یہاں آئے ہیں جن کی تعلیمات اور عقائد باقی ماندہ 'مہذب' دنیا سے میل نہیں کھاتے۔

مذہب اور کلچر

لیبر پارٹی کے ایک سابق سیاست دان ، ٹیلی ویژن براڈ کاسٹر، رابرٹ کلرائے سلک (Robert Kilroy-Silk) نے بھی ایسے ہی دکھ پہنچانے والے بیانات مسلمانوں کے خلاف دئے۔دی ٹائمز کی 17 فروری 1989ء کی اشاعت میں اس کے شائع ہونیوالے خیالات سے

شاید کوئی یہ خیال کرے کہ اس نے برطانوی لیبر پارٹی کو چھوڑ کر برطانوی نیشنل پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی ہے۔ مضمون جس کا عنوان 'نسلی اکثریت کا دفاع' ہے وہ آیت اللہ خمینی کی قتل کی سزا کے برطانوی جواب کو بزدلانہ اور پست ہمت قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ برطانوی حکومت برطانیہ کے 'مقامی آیت الاؤں' سے ہمیشہ مصالحت کرتی چلی آئی ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ برطانوی روایات، تہذیب اور قوانین میں ترمیم کرنا پڑی تا ایسے لوگوں کی ضروریات کو پورا کیا جاسکے جن کا تعلق غیر مہذب ادوار اور مقامات کی اقدار اور اخلاقی قوانین سے ہے۔

کتاب 'دی سٹینک ورسز' کے جلائے جانے کے موضوع پر کلرائے سلک تحقیرانہ رنگ میں اپنی بڑائی بیان کرتے ہوئے نسلی اقلیتوں کے غیر مہذب رتبہ کی بات کرتا ہے۔ خاص طور پر وہ لوگ جن کا تعلق برصغیر ہندو پاکستان سے ہے۔ اس کا نظریہ یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو دیکھنے میں برطانوی نہیں ضرور غیر تہذیب یافتہ ہے۔ وہ کہتا ہے:"جوں ہی کوئی نسلی اقلیت شکایت کرتی ہے وہ لوگ (برطانیہ کی سیاسی اور ثقافتی نوکرشاہی) اس بات پر رضامند ہو جاتے ہیں کہ انگلش نہ بولنے والے لوگوں کی پسند کے مطابق قوانین بنا لئے جائیں چاہے ان لوگوں کو بنگلہ دیش کے افتادہ مقامات سے آئے کچھ ہی عرصہ ہوا ہو"۔ کلرائے مغربی تہذیب کے بارہ میں متکبرانہ رنگ میں کہتا ہے کہ اس "تہذیب نے گزشتہ ایک ہزار سال میں برطانیہ میں نشو ونما پائی ہے"۔ وہ فخریہ انداز میں کہتا ہے کہ "ایک ایسی تہذیب جو پارلیمانی جمہوریت کو پسند کرتی ہو جس میں آزادی، انصاف، ایمان داری اور رواداری سب سے نمایاں ہیں اُس تہذیب سے ہزار درجہ بہتر ہے جو کتابوں کے جلانے کو کہتی ہو اور جو ایک انسان کو موت کا سزاوار محض اس لئے قرار دیتی ہو کہ اس کے نظریات غیر قدامت پسندانہ ہیں"۔

اسلام پر اس کا حملہ اس وقت پایہ تکمیل کو پہنچ جاتا ہے جب وہ شریعت کے چند قوانین کے بارہ میں اہانت آمیز فقرے کہتا ہے۔ بعینہٖ اسی طرح جس طرح سلمان رشدی نے اپنے ناولوں میں لکھے ہیں۔ "اخلاقی قوانین یا ایسی کوئی بات منطقی نہیں جو یہ کہتی ہو کہ ہمیں اس بات کو مان لینا چاہئے کہ ایک آدمی کیلئے متعدد بیویاں رکھنا جائز ہے یا جانور مذہبی رسوم کے مطابق ذبح کئے جائیں یا لڑکیوں کے ختنے کئے جائیں یا عورتوں سے جانوروں جیسا سلوک کیا جائے۔ اگر ہم نے ایک بار ایسا کرنا شروع کر دیا تو جلد ہی ہم اس مارکیٹ اسکوائر میں پہنچ جائیں گے جہاں مجرموں کو کوڑے

لگائے جاتے ہیں۔زنا کاروں کوسنگساری سے ہلاک کیا جاتا ہے۔اور چوروں کے ہاتھ کاٹ دئے جاتے ہیں"۔

کلرائے سلک نے سادہ لوحی سے حقائق کوتوڑ موڑ کر عمداً اس لئے بیان کیا ہے تا وہ اپنے مضمون کواثر انگیز بنا سکے۔اور یقیناً اس نے مذہب اور تہذیب کوآپس میں گڈ مڈ کر دیا ہے۔وہ گزشتہ ایک ہزار سال کی برطانوی تہذیب کی بات کرتا ہے جس کی وہ گردن تان کر بات کرتا ہے۔بلاشبہ برطانوی کلچر میں قابل تحسین سنگ میل آئے ہیں جن میں سے بعض تو ابھی تک قائم ہیں۔لیکن مسٹر کلرائے سلک کو یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ گزشتہ ایک ہزار سال میں جو کچھ ہو گزرا اس کا ہتک خدا اور رسول کے معاملات، کتابوں کے نذر آتش کئے جانے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔یہ عیسائی اقوام ہیں جو گزشتہ ایک ہزار سال میں خاص طور پر ایک سو سال میں ایسے قبیح مسائل میں سب سے آگے رہی ہیں۔(اس مسئلہ پر اس کتاب کے ایک باب میں تفصیلی بحث کی جا چکی ہے)۔

یہ کہنا ٹھیک ہے کہ تمام اقوام اور تہذیبوں میں زیر و بم آتے رہے اور ہر تہذیب میں اچھے اور برے پہلو بھی ہیں۔مسلمانوں کی تشدد پسندی کے معاملہ میں مغربی ذرائع ابلاغ کچھ زیادہ ہی حد سے آگے نکل گیا ہے اور اس چیز کو مسلمانوں کے عام نقطہ نظر کے طور پر پیش کیا ہے۔کتنا اچھا ہوتا اگر کلرائے سلک نے اپنے دلائل غور و فکر کے بعد تیار کئے ہوتے بجائے تکبرانہ رویہ کے اظہار کے جس کا مظاہرہ اس نے کیا ہے۔یقین جانیں آج کی مغربی تہذیب کی کمزوریاں اگر ہم بیان کرنا شروع کریں تو ان کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔

کلرائے سلک جو کہ ایک اونچے درجہ کی جانی پہچانی شخصیت اور جو ٹیلی ویژن پر تواتر سے دکھائے جانیوالے مباحثہ کے ناظرین میں قبولیت عامہ رکھتا ہے اس کو بذات خود رواداری کا مظاہرہ کرنا چاہئے جس کی مسلمانوں میں عدم موجودگی کا وہ رونا روتا ہے۔اسے چاہئے کہ جب وہ دوسروں کے بارہ میں کوئی رائے دے تو وہ الفاظ کے انتخاب میں احتیاط برتے۔

کیتھ وارڈ،(Keith Ward) کنگز کالج،لندن یونیورسٹی میں شعبہ تاریخ اور مذہب کا پروفیسر ہے،وہ بھی اکثریت والے راسخ الاعتقاد مسلمانوں کے خیالات سادہ لوحی سے پیش کرنے کے معاملہ میں اسی دام میں پھنس گیا ہے۔اس نے کم تر تعداد والے شرارت پسندوں کی آراء کو جلی

سرخیوں سے جذبات انگیز رنگ میں پیش کیا ہے۔ اخبار' دی انڈی پینڈنٹ ' کی 18 فروری 1989ء کی اشاعت میں وہ مسلمانوں میں' تنزل' اور' جدید اسلام کے تشدد والے عطیات' کا ذکر کرتا ہے۔

کلفرڈ لینگ لی (Clifford Langley) دی ٹائمز کی 8 جولائی 1989ء کی اشاعت میں ایک عجیب وغریب مفروضہ پیش کرتا ہے جو منطقی اصولوں کو للکارتا ہے۔" کتابوں کا نذر آتش کیا جانا لازمی طور پر دکانوں کے نذر آتش کئے جانے کیطرف آمادہ کرتا ہے۔ قتل کرنے کی بات چیت واقعی قتل کرواتی ہے"۔ وہ مسلمانوں کی علیحدگی یعنی اپنے ہی دائرہ ہائے زندگی میں رہنے کے میلان کو ہدف تنقید بناتا ہے اور مزید شوشہ چھوڑتا ہے کہ مسلمان ہمارے معاشرے میں تبھی قابل قبول سمجھے جائیں گے جب وہ اپنے عقائد اور ثقافت کے ساتھ سمجھوتہ کرلیں گے۔

یہ کہنا مناسب ہوگا کہ بہت سارے مسلمان اس زبردستی کی مصالحت کا نشانہ بن گئے ہیں بعض طوعاً اور بعض کرہاً اپنے احباب کے زیر اثر۔ وہ لوگ جو اپنے نظریات کا بے تکا اظہار کرتے ہیں ویسٹرن میڈیا ان کی تعریف کے گن گانے لگتا ہے۔اس کے بعد ان لوگوں کو اپنے دین کو مختلف ذرائع سے (جیسے کتابوں، تھیٹر، ٹیلی ویژن کے ڈرامے اور فلم کے ذریعہ) نقصان پہنچانے کیلئے غیر ملکی فوج کے سپاہی کے طور استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کی ایک واضح مثال رشدی کے علاوہ حنیف قریشی کی ہے جو برطانوی مسلمان ادیب ہے۔ قریشی کو بھی اسلام کے عقائد کا اپنی کتابوں میں مذاق کرنے پر مسلمانوں کے غضب کا سامنا کرنا پڑا۔ اس نے ایک فلم 'مائی بیوٹی فل لانڈریٹ' (My Beautiful Laundrette) کیلئے سکرپٹ لکھا۔ یہ فلم جس میں لواطت پسندی پر زور دیا گیا ہے لندن کی پاکستانی کمیونٹی کے متعلق ہے۔اس فلم پر انگلستان اور امریکہ میں بہت لے دے ہوئی۔ فلم کا ایک محاورہ' ہمارا ملک مذہب کی اغلام بازی سے تباہ ہو گیا ہے'، ہی دراصل اس کا مرکزی نقطہ تھا۔

حنیف قریشی نے ایک دوسری ٹیلی ویژن سیریز کیلئے سکرپٹ لکھا جس کا نام' دی بدھا آف سبربیا' (The Buddha of Suburbia) تھا۔ اس میں پاکستانی ثقافت اور اسلام کے اصولوں کو نشانہ تضحیک بنایا گیا۔ اس میں استعمال کی گئی زبان بھی فحش اور قابل مذمت تھی۔ لیکن

یہ سب "علم فن" اور "آزادی تقریر" کے نام پر قابل قبول سمجھا جاتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ وہ مسلمان ادیب جو اسلامی طرز زندگی پر متنازع نظریات رکھتے ہیں ان کو عوام تک اپنی کتابیں فراہم کرنے کے زیادہ مواقع فراہم کئے جاتے ہیں۔ ان کو ٹیلی ویژن پر پرائم ٹائم میں نمایاں جگہہ دی جاتی ہے۔ ان کی کتابوں پر مبسوط تبصرے لکھے جاتے اور ان کو کثیر الاشاعت اخبارات میں بڑے اہتمام سے شائع کیا جاتا ہے۔ لیکن اسلام کی اصل تصویر پر بننے والے پروگرام اور مباحثے شاذ و نادر ہی دکھائے جاتے ہیں اور جس وقت دکھائے جاتے ہیں اس وقت اکثر لوگ محوخواب ہوتے ہیں۔

ٹیلی ویژن پر 'دی سٹینک ورسز' پر ہونے والے مباحث کوئی ایک پروگراموں کے ذریعہ دکھایا گیا۔ کئی ایک مسلمان جن کو کوئی کبھی خاطر میں نہ لاتا تھا ان کو ٹیلی ویژن پر آ کر اپنے خیالات پیش کرنے کیلئے مدعو کیا گیا۔ لیکن اس سارے ڈھونگ کا مقصد یہ تھا کہ یہ ثابت کیا جائے کہ لامذہب لوگوں کے نظریات ٹھیک تھے۔ ایک پروگرام جسکا نام ہائپوتھیٹیکلز (Hypotheticals) تھا وہ آئی ٹی وی پر 30 مئی 1989ء کو نشر کیا گیا۔ اس پروگرام کے ذریعہ ان کو ایسا جھانسا دیا گیا تا کہ الٹا ان کا ہی مذاق اڑایا جا سکے۔ ان کو کوئی موقعہ نہ دیا گیا کہ وہ اپنے مقاصد بیان کر سکیں۔ یہ پروگرام ان سے صرف وہ باتیں حرف بحرف کہلوانا چاہتا تھا جو اس کا ڈائریکٹر چاہتا تھا۔

لیکن انصاف پسندی یہ تقاضا کرتی ہے کہ یہ کہا جائے کہ چند ایک پروگرام ایسے بھی تھے جنہوں نے مسلمانوں کو اپنے صحیح نظریات پیش کرنے کا موقعہ دیا۔ جیسے اسلامک آنسرز (Islamic Answers) جو چینل فور پر 4 مئی 1989ء کو دکھایا گیا تھا۔ یہ کہنا بھی جائز ہوگا کہ پریس کے بعض حلقوں نے مسلمانوں کی ہمدردانہ تصویر پیش کی جن کے جذبات اس مکروہ اور شرانگیز ناول کی اشاعت سے مجروح ہوئے تھے۔ تاہم یہ کہنا ضروری ہے کہ ایسے مضامین محدود چند تھے اور مجھے بڑی محنت کے ساتھ انتقامی مضامین کے پلندوں میں سے ان کو بڑی چھان بین کر کے نکالنا پڑا۔

ذرائع ابلاغ میں ہونیوالے اچھے تبصرے

The Times کے امریکن نمائندہ، کونر کروز او برائن (Conor Cruise

O'Brien) نے 22 فروری 1989ء کے اخبار میں ایک متوازن مضمون سپرد قلم کیا جس کا عنوان تھا: صحیح اور غلط کی ممانعت (Banning, right and wrong)۔ اس مضمون میں وہ سلمان رشدی کے بھارتی وزیر اعظم راجیو گاندھی کے نام ایک خط کا حوالہ دیتا ہے جو اس نے 'دی سٹینک ورسز' پر بھارتی پابندی لگنے پر بھیجا تھا۔ رشدی کا یہ خط دی نیویارک ٹائمز میں شائع ہوا تھا جس میں اس نے احتجاج کیا 'یہ کتاب اسلام کے بارہ میں نہیں ہے'۔ کونراو برائن دلیل دیتا ہے کہ اگرچہ کتاب اسلام پر نہیں ہے لیکن اس کے کثیر حصے صاف طور پر اسلام کے متعلق ہیں بلکہ اس میں قرآن سے حوالے بھی دئے گئے ہیں۔ رشدی کہتا ہے کہ دی سٹینک ورسز میں دئے گئے پیغمبر کا نام محمد نہیں ہے'۔

کونراو برائن اس دھوکے کو صاف دیکھ سکتا اور اس شرارت کو دودھاری کہتا ہے۔ وہ مزید وضاحت کرتا ہے کہ محمد کو اس ناول میں ماہونڈ کہا گیا ہے۔ اگر آپ آکسفورڈ انگلش ڈکشنری میں ماہونڈ کے معنی تلاش کریں تو درج ہے: "مفتری نبی محمد...... ایک جھوٹا دیوتا، ایک بت...... ایک عفریت، ایک بھیانک مخلوق...... جو شیطان کیلئے بطور نام کے بھی استعمال کیا جاتا ہے"۔ یہ ایسے سخت القابات ہیں جن کا بازاروں میں بلوہ کرنیوالے ہجوم پر سکون بخش اثر ہوگا۔

او برائن آیت اللہ خمینی اور دوسرے مسلمانوں کے ردعمل کو بھی بخوبی سمجھتا ہے جو اپنے دین کی روایات پر پابند ہو کر عمل پیرا ہیں جس طرح ماضی میں یہودی اور عیسائی ہوا کرتے تھے۔ وہ کہتا ہے کہ آیت اللہ کی رشدی کیلئے موت کی سزا ہر کسی عیسائی یا یہودی کیلئے نا قابل فہم نہیں ہونی چاہئے۔ پرانے عہد نامہ میں خدا موسیٰ کو تاکید کرتا ہے: "اور ہر وہ شخص جو خدا کے نام کا استہزاء کرتا ہے، اسے لازماً مار ڈالا جائے گا، اور تمام حاضرین مجلس اس پر سنگساری کریں گے" (Leviticus24:14)۔ او برائن اس آیت کے ساتھ زبردست موازنہ کرتا ہے: "جب ہم مسلمانوں کی اس بات پر سرزنش کرتے ہیں کہ ہتک خدا اور رسول کی سزا موت ہونی چاہئے یوں لگتا ہے جیسے ہم کہہ رہے ہوں: تمہیں جرأت کیسے ہوئی کہ اپنی بیوی کو زدوکوب کرو جب کہ میں نے اپنی بیوی کو پیٹنا بند کر دیا ہے؟"۔

خمینی کے فتویٰ کے جاری ہونے کے ایک سال بعد The Guardian اخبار کے

14 فروری 1990ء کے اداریہ میں ایک بصیرت افروز اور معقول نقطہ نظر پیش کیا گیا تا نزاعی گروہوں کے مابین کسی قسم کی مصالحت کا سامان پیدا کیا جا سکے۔ مثلاً اس میں اسلام کو ہمدردانہ رنگ میں پیش کیا گیا: "اسلام ایک جنگ وجدل والا دین نہیں ہے۔ قرآن میں یہ چیز موجود ہے کہ حضرت محمدؐ نے تاکید کی کہ ایک ہتک خدا ورسول کرنے والے شخص کے ساتھ ہمدردانہ سلوک کیا جائے جس نے آپؐ پر پاجی اور کمینہ ہونے کا الزام عائد کیا تھا"۔

مذکورہ اقتباس مسلمانوں کے اس غصہ کے اظہار کی بھی حمایت کرتا ہے: "جو شکایت کرنے میں حق بجانب ہیں کہ جس طور سے رشدی نے استحقاق کے بغیر ان کے عقائد کا تمسخر کیا ہے جو ان کے نزدیک مقدس ہیں۔ اور انہیں یہ حق حاصل ہے کہ وہ صدائے احتجاج بلند کریں اور مصنف کو منہ توڑ جواب دیں۔"

اداریہ تحریر کرنیوالے نے مسلمانوں کو مدبرانہ مشورہ دیا ہے کہ وہ: "(برٹش اور اسلامی قانون کے تحت) غیر قانونی فتویٰ سے اپنا تعلق توڑ لیں۔ اس کے ساتھ اس نے بڑی ہوشیاری سے اس بات کی بھی نشاہدہی کی ہے: "صرف تشدد پسند ملاؤں کی تھوڑی سی تعداد نے موت کی سزا کی حمایت کی ہے"۔ اور یہ کہ "عوام کو یہ بھیانک اور خطرناک تاثر دیا جاتا ہے کہ وہ اکثریت کی نمائندگی کرتے ہیں"۔ مقام افسوس ہے کہ طاقتور اور بارسوخ اسلام مخالف گروہوں کے آپس میں گٹھ جوڑ کی وجہ سے یہ دیرپا تاثر ابھی تک قائم ہے، یعنی مغربی ذرائع ابلاغ اور پوری دنیا کی مصنفین کی انجمنوں نے رشدی کو ہیرو بنادیا ہے۔

سولھواں باب

رشدی کو دیوتا بنا دیا گیا

ادبی دنیا نے فتویٰ کی مذمت اور رشدی کی حمایت میں اتحاد کا نمونہ پیش کیا ہے۔لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسلمانوں کیلئے حالات نا قابل برداشت بنانے کیلئے اوران کے زخموں پر نمک چھڑکنے کیلئے وہ اس تگ و دو میں لگے ہوئے تھے کہ رشدی کو ہیرو بنا دیا جائے یا اسے ادبی دیوتا کے روپ میں پیش کیا جائے۔طرفہ یہ کہ انھوں نے مغرب کا سب سے بڑا ادبی انعام بھی اسے نوازا۔ اس نے 23 بکر ایوارڈ (Booker Award) جیتنے والوں کو مات کر دیا جب اُس نے 1981ء میں لکھے جانے والے اپنے ناول *Midnight's Children* پر سب سے پہلا بکر آف بکرز ایوارڈ 20 ستمبر 1993ء کو حاصل کیا۔اس ایوراڈ کو حق بجانب ثابت کرنے کیلئے دی ٹائمز نے 21 ستمبر 1993ء کے اداریہ میں لکھا: "سلمان رشدی کے ناول مڈ نائٹس چلڈرن کو بکر آف بکرز ایوارڈ کا دیا جانا افسانہ نگاری کے اس گراں قدر ناول کا منصفانہ اعتراف ہے۔مزید برآں یہ کہ (ایوارڈ) عقوبت زدہ ناول نگار کو رشدی افئیر اور *The Stanic Verses* کے منحوس سایہ سے نجات دلا دے گا"۔

یہ انعام اس کو اس لئے دیا گیا کہ اسے بھینٹ کا بکرا بنایا گیا اس نے بنیاد پرستوں کو للکارا اور اپنے نظریات کو شدت سے گلے لگائے رکھا۔تاہم حقائق اس کے برعکس ہیں۔رشدی نے محسوس کیا کہ بہت سارے لوگوں نے اس کو دھوکہ دیا جنہوں نے اس کو بہت کچھ دینے کا وعدہ کیا تھا۔لیکن ہوا یہ کہ وہ کاسہ گدائی ہاتھ میں لے کر ہر کس و ناکس کے پاس گیا کہ وہ ایران پر دباؤ ڈالیں کہ فتویٰ منسوخ کر دیا جائے۔دباؤ کی یہ تحریک امریکہ تک پہنچ گئی۔مشہور امریکی رائیٹر نارمن میلر (Norman Mailer) اور آرتھر ملر (Arthur Miller) نے امریکن صدر بل کلنٹن کو قائل کیا کہ وہ سلمان رشدی سے ملاقات کرے۔

آخر کار کلنٹن رشدی سے نومبر 1993ء میں وائٹ ہاؤس میں ملاقات کیلئے تیار ہو گیا۔ اس ملاقات پر دی ٹائمز کے الیگذ انڈر چانسلر کی رائے یہ تھی : " ایک ایسی زبردست اہمیت کی ملاقات جو شاید رشدی پر ابتلاء کے اختتام کا آغاز ثابت ہو"۔ چانسلر کے خیال میں ایسا اس حقیقت کے باوجود کیا گیا کہ "جس سے اسلامی دنیا مشتعل ہو جائے"۔

(*The Times,* December 04, 1993)

اور یہی فیصلہ کن و حتمی نقطہ ہے۔ رشدی کے حمایتیوں اور مجرم ساتھیوں کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی کہ انھوں نے کروڑوں مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کیا ہے۔اس چیز کو بہت اہمیت دی گئی یعنی ایک شخص کی آزادی تقریر کے حق کو جس نے جان بوجھ کر اور بدطینتی سے کروڑوں مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی تھی۔

ایک ایسا ہی اور کیس بنگلہ دیش کی رائیٹر تسلیمہ نسرین کا ہے جس نے یہ کہہ کر مسلمانوں کے غضب کو مزید بھڑکا دیا کہ " قرآن پر مکمل طور پر نظر ثانی کی ضرورت ہے "۔ "جب بنگلہ دیشی حکومت نے اس کی گرفتاری کا حکم جاری کیا کہ اس نے دینی جذبات کو مجروح کیا ہے اور مسلمان تشدد پسندوں نے اس کو قتل کی دھمکیاں دیں تو وہ 4 جون 1993ء کو روپوش ہو گئی"۔

(*The Times,* July 14, 1993)

شاید وہ جلا وطنوں کے غیر تحریری مجموعہ قوانین کا پابند تھا کہ رشدی کو مجبور کیا گیا کہ وہ تسلیمہ نسرین کیلئے حمایتی اکٹھے کرے۔ اس نے اپنے لئے دنیا بھر میں حمایتی پیدا کر کے کافی اثر ورسوخ پیدا کر لیا تھا اب اس نے یہ اثر ورسوخ دو مقاصد کیلئے استعمال کیا۔اول تو اس نے نسرین کی ناگوار صورت حال کو اچھالا کیونکہ جتنے تعداد میں زیادہ ہوں گے اتنا ہی اچھا ہو گا۔ دوسرے اس کی یہ نیک کوشش اس کو خود ہتھیاروں سے لیس جوانمرد بنا دے گی۔ ضمنی فائدہ یہ کہ ان عیار اوصاف کے ساتھ مسٹر رشدی بحیثیت سیاست دان بھی چمک اٹھے گا۔

کچھ بھی ہو حقیقت یہی ہے کہ رشدی ایک مطلوبہ مجرم ہے اور بعض نے اس کو تا حیات ادیبوں میں سے مشہور ترین ادیب قرار دیا ہے (یا شاید بدنام ترین کہنا مناسب ہو گا)۔اس کیلئے ہمیں ایرانی فتویٰ کا ممنون ہونا چاہئے جو *The Stanic Verses* کی اشاعت کے بعد اس پر لاگو ہوا تھا۔ کیا یہ سب کچھ ارادی طور پر کیا گیا تھا یا کہ ایک منصوبہ بندی کے مطابق تھا جو بری

طرح ناکام ہوگیا۔ جو کچھ بھی متنازع اور دین کی مذمت کرنیوالے ناول کے دفاع میں لکھا گیا ہے اس سے قطع نظر اس بات میں کوئی شک نہیں کہ رشدی اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ کیا کررہا تھا اور کس قسم کے جال میں وہ اپنے آپ کو پھنسارہا تھا۔ یہ بھی ہر ایک کو معلوم ہے کہ ادبی دنیا کے ممتاز ادیبوں نے اس کو قبل از اشاعت خطرناک نتائج سے آگاہ کردیا تھا۔

رشدی کو پہلے سے انتباہ

کئی رپورٹیں اس قسم کی موجود تھیں جن سے صریح طور پر معلوم ہوتا تھا کہ رشدی نے اسے دئے جانیوالے عقلمندانہ مشوروں کونظرانداز کردیا تھا۔ٹام کیلسی (Tom Kelsey) اورڈیوڈلسٹر (David Lister) کی تیارہ کردہ ایک رپورٹ کے مطابق *The Stanic Verses* کے پبلشرز نے ناول کی اشاعت سے قبل مذہبی ماہرین سے مشورہ طلب کیا۔انہیں تنبیہ کی گئی کہ "اس کی اشاعت سے ایسی دہشت گردی شروع ہوگی جس کوکوئی شخص یا ملک کنڑول نہ کرسکے گا"۔ وہ نو یہودی اور عیسائی ادیب جن کواشاعت سے تین ماہ قبل پبلشرز کی طرف سے ڈرافٹ کاپی موصول ہوئی ان کا متفقہ فیصلہ تھا:"اس کتاب کوافسانہ ہرگز نہ کہا جائے کیونکہ اس میں تاریخی شخصیات کا ذکر کیا گیا ہے جس سے متعدد لوگ آزردہ خاطر ہوں گے......اس کے باوجود پبلشرز نے کتاب شائع کردی"۔

(*The Independent*, UK. March 06, 1989)

پبلشرز کا معاملہ تو سیدھا سادھا ہے۔ان کے نزدیک ایک کتاب جتنی نزاعی ہوگی اس کی فروخت اتنی ہی زیادہ ہوگی۔ یہ تو کسی بھی پبلشر کا سنہرا خواب تھا کہ کوئی کتاب اس قدر نزاعی ہو اور اتنی شہرت حاصل کرلے۔لیکن یہ سپنا جلد ہی ایک ڈراؤنے خواب میں تبدیل ہوگیا کم ازکم مصنف کیلئے تو ضرور۔اس کو شاید اُس سے زیادہ طاقتور قوتوں نے استعمال کیا ہو۔ اور اسے شاید قربانی کا بکرا بنایا گیا ہو کچھ بھی ہو وہ اتنا بھی معصوم نہ تھا جیسا کہ اس نے بننے کی کوشش کی۔

ایک تلخ آمیز مشاہدہ

رشدی کا اس ناول کے لکھنے کا محرک بلاشبہ مشکوک تھا۔ممتاز برطانوی مصنف رولڈ ڈاھل

(Roald Dahl) جو مصنفین کی انجمن کا ممبر اور جو شاید پہلا غیر مسلمان ادیب تھا جس نے رشدی کو بے نقاب کیا۔ دی ٹائمز کی 28 فروری 1989ء کی اشاعت میں اس کے شائع ہونیوالے خط سے ایک بڑا اہم سوال اٹھا۔ اس نے لکھا کہ: "رشدی کے معاملہ کے بارہ میں ابھی تک جو کچھ لکھا اور کہا گیا ہے، میں نے ابھی تک ایک بھی غیر مسلم کو مصنف پر تنقید کرتے نہیں دیکھا۔ اس کے برعکس اسے ایک قسم کا ہیرو بنا کر پیش کیا جاتا رہا...... میرے نزدیک وہ ایک خطرناک موقعہ پرست ہے۔ یقیناً اسے مسلمانوں کے مذہب، اس کے عوام کے بارہ میں کافی معلومات حاصل تھیں۔ اسے ضرور اس امر کا احساس ہوگا کہ اس کی کتاب سے کس قسم کی گہرے اور متشددانہ جذبات مذہبی مسلمانوں میں بھڑک اٹھیں گے۔ بالفاظ دیگر جو کچھ وہ کر رہا تھا اسے اس کا خوب علم تھا اس لئے اسے معافی کا طلبگار نہیں ہونا چاہئے"۔

رولڈ ڈاھل اپنے خط کو ایک قابل ذکر مشاہدہ کے ساتھ ختم کرتا ہے جس کو مغربی ذرائع ابلاغ اور رشدی کے حمایتی نظر انداز کر گئے ہیں: "آج کی تہذیب یافتہ دنیا میں ہم سب پر یہ اخلاقی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ہم ایک حد تک اپنی تحریروں پر خود پابندی لگائیں تا کہ آزادیٔ تقریر کے حق کو مضبوط بنایا جا سکے"۔

The Times (20 فروری 1989ء) نے ایک اور مضمون اس عنوان کے تحت شائع کیا '*Penguin under fire for ignoring expert advice*'۔ اس کے لکھنے والے اینڈریو مارگن (Andrew Morgan) اور پیٹر ڈیون پورٹ (Peter Davenport) تھے۔ یہ مضمون اس مشورے کو زیر بحث لاتا ہے جو پینگوئین کمپنی نے انڈیا میں اپنے ایڈیٹوریل مشیر مسٹر خشونت سنگھ سے 1988ء میں موسم گرما میں کیا تھا۔ مسٹر سنگھ نے کہا تھا کہ اس کو پورا یقین ہے کہ ناول کے شائع ہونے سے مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں گے۔ "ناول میں بہت سارے اہانت آمیز حوالے رسول اللہ اور قرآن کے بارہ میں ہیں اور محمدؐ کو ایک معمولی پاکھنڈ کے طور پر پیش کیا گیا ہے"۔ یہ بات مسٹر سنگھ نے دوبارہ دہرائی کیونکہ وہ اس سے پہلے ناول کے مسودہ کو یہ کہہ کر مسترد کر چکا تھا کہ یہ 'مہلک ترین' ہے۔ مسٹر سنگھ نے پینگوئین کمپنی کے مارکیٹنگ ڈائریکٹر سے لندن میں ملاقات کی جو پینگوئین انڈیا کا چیئر مین بھی ہے۔ "وہ کچھ حیران سا تھا اور جھلایا ہوا بھی

کیونکہ وہ (رشدی کو) بھاری پیشگی معاوضہ ادا کر چکے تھے"۔

یہ پیشگی معاوضہ کی رقم ایک ملین ڈالر تھی جس کے بارہ میں سن کر ہر ایک کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس ناول کے متعلق ضرور کچھ دال میں کالا تھا جب انسان یہ سوچے کہ برطانیہ میں سب سے منافع بخش ادبی ایوارڈ 'David Cohen British Literature Prize' کی رقم محض چونتیس ہزار پاؤنڈز تھی۔ سارے معاملہ میں ضرور گڑ بڑ تھی۔ پیشگی معاوضہ میں اتنی بڑی رقم کا دیا جانا اس سے سازش اور مشتبہ لین دین کی بو آتی تھی جس کا تعلق مافیا اور اس قماش کے لوگوں سے ہوتا ہے۔ اس رقم کا دیا جانا یہ بھی تجویز کرتا تھا کہ مصنف کو یہ رقم اس لئے دی جارہی تھی کیونکہ وہ اپنی زندگی داؤ پر لگا کر موت وحیات کا سب سے بڑا جوا کھیلنے والا تھا۔

ہمیں اس امر کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہئے کہ اشاعتی کمپنی جس نے پیشگی رقم اسے دی تھی وہ یہودیوں کیلئے ذہنی میلان رکھتی تھی ۔ یہ ادبی حملہ صرف اسلام پر تھا عیسائیت اور یہودیت کے خلاف کچھ نہ کہا گیا تھا۔ اس سازش کے پیچھے کن کا ہاتھ تھا اس کو سمجھنے کیلئے کسی کا ذہین ہونا ضروری نہیں۔ رشدی ہی ایسا واحد شخص تھا جس کو آسانی سے معین قیمت پر خریدا جا سکتا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ مسلمانوں کو کس طریق سے سب سے زیادہ تکلیف پہنچا سکتا تھا۔ جیسا کہ اخبار 'دی گارڈین' کے جان ایذارڈ (John Ezard) نے لکھا: "سلمان رشدی جس کی پرورش اسلامی گھرانے میں ہوئی بالکل ٹھیک علم رکھتا تھا کہ سوئی کہاں چبھوئی جائے"۔

(15 فروری 1989ء)

اپنی قسمت کا مالک

ابھی تک جو کچھ لکھا گیا اور جو حوالے پیش کئے گئے ان کا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ رشدی ایک رضامند تخریب کار تھا جس کو مغرب کی عیسائی اقوام نے اس لئے استعمال کیا تا وہ اسلام پر اپنے حملے جاری رکھ سکیں۔ رشدی نے بے شک اس الزام کی تردید کی لیکن اس کا طور اطوار اور معذرت خواہیاں جو اخبارات میں شائع ہوئیں وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ خود اپنی قسمت کا مالک تھا۔

نیو کالج، آکسفورڈ کے پروفیسر مائیکل ڈومیٹ (Michael Dummett) نے رشدی

کے نام کھلا خط لکھا جو اخبار The Independent (11 فروری 1989ء) میں شائع ہوا تھا۔ اس خط میں پروفیسر موصوف نے یہ راز فاش کر دیا کہ کس طرح رشدی سب سے زیادہ پیسے دینے والے کو اپنا مسودہ دینے پر تیار ہو گیا تھا۔ رشدی کو مخاطب ہوتے ہوئے پروفیسر ڈومیٹ نے لکھا:

"The Stanic Verses کی اشاعت سے قبل تم برطانیہ کی نسلی اقلیتوں میں ٹیلی ویژن پر برطانوی نسلی پالیسی کی مذمت کرنے پر ہیرو سمجھے جاتے تھے ان لوگوں کے حلقہ سے باہر جنہوں نے تمہاری کتابوں کا مطالعہ کیا تھا...... یہ تمہارا ہیرو کا مرتبہ تھا جس سے تمہاری کتاب دھوکہ بازی دکھائی دیتی ہے۔ تم چاہے کتنا بھی چاہو تم وہ کردار دوبارہ کبھی بھی ادا نہ کر سکو گے۔ تم سفید فام تعصب کو ملامت کرنے کا حقدار اب کبھی نہیں بن سکتے کیونکہ اب تم ہم میں سے ایک ہو۔ تم اعزازی سفید آدمی بن گئے ہو، دکھاوے کا اعزازی سفید فام دانشور یہ سب کچھ ٹھیک مگر ہر حال میں تم اعزازی ہی رہو گے۔"

پروفیسر ڈومیٹ رشدی پر درج ذیل الزام عائد کرتا ہے: "اگر تمہیں اس گہری چوٹ کا احساس نہ تھا جو تم مسلمانوں کو لگانے والے تھے، تو پھر تم اس موضوع پر لکھنے کے حقدار نہ تھے جس کا انتخاب تم نے کیا۔ خیر کچھ بھی ہو کوئی شخص ایک برے فعل کے برے نتائج قبل از وقت دیکھ لینے سے محروم رہنے کی وجہ سے اس کا ذمہ دار قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن اب تم جانتے ہوئے اس بات پر مصر ہو کہ کتاب کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ہو"۔

سترھواں باب

رشدی The Stanic Verses کے دفاع میں

فتویٰ کے جاری ہونے کے بعد رشدی ایک نئے دور میں داخل ہوا جب اس نے رسوائے زمانہ ناول کے لکھے جانے کی ناپائیدار توجیہات پیش کرنا شروع کیں۔ کبھی تو وہ ناول کا دفاع کرتا تھا اور کبھی وہ جذبات مجروح کرنے پر عذرخواہیاں پیش کرتا تھا۔ اور پھر کبھی وہ بالکل ہی معذرت خواہ نظر نہ آتا تھا۔ فتویٰ کے جاری ہونے کے بعد سے لیکر اب تک کے عرصہ نے یہ ثابت کر دیا کہ رشدی کے کردار میں کون سی سیماب نما تبدیلیاں ہوئیں جس سے اس کا اصل کردار ابھر کر سامنے آ گیا۔

اس پر موت کی سزا لاگو ہونے کے فوری بعد جب رشدی کو جان کے لالے پڑ گئے تو اس نے کتاب کا دفاع یہ کہہ کر کیا: "یہ اسلام یا کسی اور مذہب پر حملہ نہ تھا۔ یہ دراصل عصبیت کو چیلنج کرنیکی اور دنیا کے غیر مذہبی اور مذہبی نظریات میں اختلاف کے پڑتال کرنیکی کوشش تھی"۔
(*The Times,* February 15, 1989)

اب اس کتاب کو کون افسانہ کہہ سکتا ہے؟ رشدی ٹیلی ویژن کے چینل فور کے ایک پروگرام میں آیا جو بنڈونگ فائل (Bandung File) نے 14 فروری 1989ء کو نشر کیا تھا۔ اس پروگرام میں اس نے اپنے نظریات کا دفاع کرنے میں کوئی لچک نہ دکھائی۔ اس کو مسلمانوں کے ردعمل کی اتنی امید نہ تھی: "میرا خیال تھا کہ ملا لوگ اسے پسند نہ کریں گے۔ میں نے تو اس کو ملاؤں کیلئے لکھا ہی نہ تھا۔ میں جانتا ہوں ملاؤں نے گزشتہ گیارہ سالوں میں پاکستان میں جو کچھ کیا ہے ......میں جو مناسب سمجھوں اسے تحریر میں لانے کا حق رکھتا ہوں"۔

رشدی کو ملاؤں کے بارہ میں کافی کچھ معلوم ہے۔ اسے یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ ملاؤں کا عوام پر خطرناک حد تک اثر ہے لہٰذا عوام کا ردعمل ویسا ہی ہوگا جیسا کہ ملاؤں کا۔ اس لئے یہ جانتے ہوئے کہ اس سے مسلمانوں کو کس قسم کی چوٹ لگے گی وہ اس بات کو نظر انداز کرتے ہوئے

آزادیٔ تقریر کے نام پر ناول کے لکھنے میں مصروف رہا۔ پھر وہ یہ فضول شیخی بھی بھگارتا ہے کہ: "اگر تم کوئی کتاب پڑھنا نہیں چاہتے تو پھر کوئی تمہیں پڑھنے پر مجبور نہیں کرسکتا۔ یہ بہت مشکل ہے کہ کوئی 'دی سٹینک ورسز' پڑھ کر دلگیر ہو جائے کیونکہ اس کو محو ہو کر پڑھنے کیلئے لمبا عرصہ چاہئے اور یہ ڈھائی لاکھ الفاظ پر مشتمل ہے"۔ یہ تنگ نظر مفروضہ اتنا ہی بودہ تھا جتنا کہ یہ نامعقول تھا۔ اس صورت حال کو جس سے وہ دوچار ہے ٹھیک کرنے کیلئے اس کو اس سے بہتر عذر تراشنا ہوگا۔

جب اس سے اس بحث کے بارہ میں استفسار کیا گیا جہاں اس نے قرآن کے تاریخی متن کو ڈرامہ کی صورت میں پیش کیا ہے تو وہ بخوشی تسلیم کرتا ہے کہ یہ سارے کا سارا سچے تاریخی واقعات پر مرتب کیا گیا تھا۔ مثلاً وہ کہتا ہے: "ان ابواب میں سارے کا سارا مواد - خوابوں کا سلسلہ - ان کا آغاز تاریخی یا نیم تاریخی ہے اگرچہ آپ پورے وثوق سے محمد کی زندگی میں ہونیوالے واقعات کے بارہ میں کچھ کہہ نہیں سکتے...... محمد کے بارہ میں دلچسپ بات یہ ہے کہ مقدس کتاب کے علاوہ بھی اس کی زندگی پر قطعی معلومات موجود ہیں "۔

پھر رشدی کہتا ہے کہ کتاب لکھنے کا مدعا یہ تھا کہ ایسے موضوعات کو پرکھا جائے جو دو سوالوں کا جواب دیں سکیں: "جب ایک تصور (اسلام) دنیا میں ظاہر ہوتا ہے تو یہ دو بڑی آزمائشوں سے دوچار ہوتا ہے: "جب تم کمزور ہو تو سمجھوتہ کرلو۔ جب تم طاقتور ہو تو کیا تم روادار ہو؟" اس سوال کے جواب میں وہ صاف طور پر حضور نبی پاک ﷺ کے بارہ میں گویا ہے: "جہاں تک ہم محمد کی زندگی کے بارہ میں کچھ کہہ سکتے ہیں...... اس نے امکانی طور پر وحدانیت کے بارہ میں سمجھوتہ کرنیکی ممکنہ کوشش کی تھی جس کو بڑی عجلت سے مسترد کر دیا گیا"۔

رشدی کی دیدہ دلیری اور بے ہودگی ملاحظہ کیجئے۔ وہ مصر ہے کہ اس ناول کو افسانہ سمجھا جائے اور ساتھ ہی وہ تسلیم کرتا ہے کہ وہ محمد ﷺ کے بارہ میں لکھ رہا تھا۔ نیز یہ کہ 'ماہونڈ' سے مراد محمد (ﷺ) ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ عمداً مسلمانوں کو اشتعال دلا رہا تھا۔ (اس مضمون کا ترمیم شدہ حصہ The Guardian میں 15 فروری 1989ء کو شائع ہوا تھا)۔ رشدی دلیل دیتا ہے کہ ' ماہونڈ' سے مراد محمد ﷺ نہیں بلکہ یہ ناول کے کردار جبرائیل کے خوابیدہ دماغ کا شاخسانہ ہے۔ رشدی کا دفاع مذہبی بنیادوں کے ہل جانے سے گرجاتا ہے۔ پروفیسر یعقوب ذکی

کہتا ہے کہ: "پیغمبر تمام مخلوق میں سے ایک ایسی مخلوق تھے جس کا روپ اختیار کرنیکی اجازت خدا شیطان کو نہیں دیتا۔ اس لئے جب خواب میں انسان کو پیغمبر نظر آئیں تو ہمیں یقین ہوتا ہے کہ یہ خواب ضرور بالضرور سچا ہوگا"۔

پروفیسر ذکی رشدی کے ناول کے عنوان کے انتخاب پر ایک اور دلچسپ نقطہ پیش کرتا ہے جس سے رشدی کا فریب فاش ہو جاتا ہے: "رشدی نے اس شیطان کے نام کو استعمال کیا جو دھوکہ بازی کا ذمہ دار تھا۔ اس کا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ پورے کا پورا قرآن من گھڑت ہے اور محمد ایک دغاباز مفتری۔ یہ صرف دو آیات کا سوال نہیں جو پیش کی گئیں بلکہ تمام کی تمام 6236 آیات کا جن پر قرآن مشتمل ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کا عنوان ذومعنی تھا" (یعقوب ذکی جس کا سابقہ نام جیمز ڈکی (James Dickie) تھا وہ برطانوی مسلمان، مصنف اور ہارورڈ یونیورسٹی میں پروفیسر ہے)۔

رشدی بیان دیتا ہے

رشدی کے بددلی سے دئے ہوئے بیان سے یہ صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ جو اس کا مقصود تھا اس کے حاصل کرنے میں اس کا حیلہ بہانہ کام کر گیا۔ اس کے بیان کا کھوکھلا اور منافقانہ لہجہ بھی غور کرنے کے قابل ہے جس کا پورا متن درج ذیل ہے: "دی سٹینک ورسز کے مصنف کی حیثیت سے میں اس بات سے بخوبی واقف ہوں دنیا کے کثیر ممالک میں مسلمان اس ناول کی اشاعت سے دلگیر ہوئے ہیں۔ میں اسلام کے مخلص ماننے والوں سے صمیم قلب سے معذرت خواہ ہوں جو دلآزاری ان کو اس کتاب کی اشاعت سے ہوئی ہے۔ یہ دنیا جس میں ہم رہ رہے ہیں جو متعدد مذاہب پر مشتمل ہے یہ تجربہ ہمیں سکھاتا ہے کہ ہمیں دوسروں کے جذبات کا احترام کرنا چاہئے۔(*The Times,* February 20, 1989) یہ بیان اس نے کچھ روز بعد دیا تھا جبکہ اس سے چند روز قبل اس نے درج ذیل بیان دیا تھا: "دل لگتی بات یہ ہے کہ کاش میں نے اس سے زیادہ تنقیدی کتاب لکھی ہوتی...... ایسے محسوس ہوتا ہے کہ اسلامی بنیاد پرستی اس وقت تھوڑی سی تنقید سہہ سکتی ہے"۔

(*The Washington Times*, February 15, 1989)

رشدی کا الٹے پاؤں پھر جانا

دوسال روپوش رہنے کے بعد سلمان رشدی نے اپنا لہجہ بدل لیا۔شاید یہ بین الاقوامی دباؤ کی وجہ سے تھا یا شاید اس کے قصور وار ضمیر نے اس کو ملامت کیا یا شاید یہ اس کی کم ہمتی کی وجہ سے تھا۔رشدی نے اب ایک بیان جاری کیا جس میں اس نے کہا کہ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اللہ کے آخری نبی ہیں۔دی ٹائمز اخبار کے مذہبی امور کے رپورٹر روتھ گلیڈ ہل (Ruth Gledhill) نے *The Stanic Verses* میں موجود رشدی کے بیانات کی تردید میں 27 دسمبر 1990ء کو مضمون سپرد تحریر کیا۔رشدی کا تردیدی بیان کرسمس کے موقعہ پر اس کی مصر کے مذہبی امور و اوقاف کے وزیر محمد علی ماغوب، اور دوسرے مسلم اکابرین کے ساتھ ملاقات کے بعد جاری ہوا۔علاوہ دیگر باتوں کے اس بیان میں کہا گیا:" وہ ناول میں بولنے والے کرداروں کے ادا کئے گئے بیانات سے اتفاق نہیں کرتا جو مذہب اسلام کی توہین کرتے ہیں۔اس نے اس بات پر آمادگی کا اظہار کیا کہ " دی سٹینک ورسز" کا پیپر بیک ایڈیشن اور ناول کے مزید تراجم کی وہ اس تنازعہ کے دوران اجازت نہ دے گا"۔

اس بیان سے واضح ہے کہ ناول میں اسلام کے خلاف توہین آمیز مواد موجود تھا اور یہ کہ وہ اس سے بخوبی آگاہ تھا۔اس نے تردیدی بیان کو درج ذیل وعدہ کے ساتھ ختم کیا:" میں اسلام کو دنیا میں بہتر طور پر سمجھنے کے لئے کام جاری رکھوں گا جیسا کہ میں نے ماضی میں ہمیشہ ایسا کرنیکی کوشش کی تھی"۔رشدی نے دی ٹائمز اخبار میں 28 دسمبر 1990ء کو مضمون لکھا جس میں اس نے گذشتہ تردیدی بیان کی وضاحت درج ذیل عنوان کے تحت کی 'میں اسلام کی آغوش میں کیوں آیا؟'۔شاید یہ فتویٰ کے خوف کی وجہ سے اس کے سر پر تھوپا گیا تھا یا شاید اس نے صمیم قلب سے توبہ کر لی تھی۔یہ بھی ممکن ہے کہ وہ برطانوی حکومت کے ایران کے خلاف کوئی ایکشن نہ لینے کی وجہ سے مایوس ہو گیا تھا یعنی حکومت ایران پر دباؤ ڈالا جائے کہ وہ فتویٰ کو منسوخ کر دے۔اس نے محسوس کیا کہ اب کوئی چارہ نہ رہ گیا تھا ماسوا اس کے کہ وہ کھلے بندوں سامنے آجائے اور ذاتی طور پر اسلامی دنیا کے ساتھ سمجھوتہ کی کوشش کرے۔اس نے اپنی غیر اسلامی تربیت کے بارہ میں کمزور توجیہات پیش کرنی

شروع کردیں:

"اگرچہ میرا تعلق مسلمان گھرانے سے ہے لیکن میری پرورش کبھی بھی ایک سچے مسلمان کے طور پر نہ ہوئی تھی۔ میری پرورش ایسے ماحول میں ہوئی جس کو عمومی طور پر آزاد مذہب انسانیت کہا جاتا ہے"۔ پھر وہ کہتا ہے: "میں یقیناً ایک اچھا مسلمان نہیں ہوں۔ لیکن اب میں اس موڑ پر ہوں کہ کہہ سکوں کہ میں مسلمان ہوں۔ بلکہ یہ چیز خوشی کا باعث ہے کہ میں اب حلقہ اسلام میں ہوں۔ ایسے معاشرہ کا حصہ ہوں جس کی اقدار مجھے ہمیشہ ہر دلعزیز رہی ہیں"۔ پھر وہ اپنے ناول کا بددلی سے دفاع کرنیکی کوشش کرتا ہے: "میں دوسال سے زیادہ عرصہ سے یہ واضح کرنیکی کوشش کررہا ہوں کہ 'دی سٹینک ورسز' کے لکھنے کا مقصد کسی کی توہین نہ تھا۔ مزید یہ کہ مذہب پر حملے کتاب کے مرکزی کردار کی تباہی کی علامت ہیں نہ کہ مصنف کے نقطہ نظر کی مثال"۔

مصیبت یہ ہے کہ وہ کتاب میں توہین آمیز مواد ہونیکا اعتراف کرتا ہے لیکن اس مواد کا اس کے اپنے ذاتی خیالات ہونیکی تردید کرتا ہے۔ شاید یہ اس کے ساز باز کرنیوالے آقاؤں کے نقطہ نظر کی مثال ہے جنہوں نے اس کو پیشگی رقم ناول لکھنے کیلئے دی تھی۔ انسان جتنا زیادہ اس کے بیان کا مطالعہ کرتا ہے اتنا ہی زیادہ اس بات سے آگاہ ہوتا ہے کہ رشدی بڑی ناامیدی سے تنکوں کا سہارا لے رہا ہے۔ ایک طرف تو وہ بودے بہانے بنا کر اپنے ادبی کام کا اور اس کے تخیلاتی مواد کا دفاع کرتا ہے تا کہ اس کو اسلامی برادری میں ایک بار پھر شامل کرلیا جائے مگر دوسری طرف وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ اس کی کتاب کو من وعن قبول کرلیا جائے۔ یہ مضمون متنازع باتوں کا مجموعہ ہے، بالخصوص دو بیانات جو قریباً ایک دوسرے کے آمنے سامنے شائع ہوئے ہیں۔

بیان نمبر ایک: "خیر سگالی کی نئی فضا میں حصہ ڈالنے کے طور پر میں اس بات پر رضا مند ہوا ہوں کہ میں 'دی سٹینک ورسز' کے نئے ترجمہ کی اجازت نہ دوں گا، اور نہ اس کا پیپر بیک ایڈیشن شائع ہوگا جب تک کہ مزید توہین کا خدشہ باقی رہتا ہے"۔

بیان نمبر دو: "میرے خیال میں کتاب کا مہیا ہونا جاری رہنا چاہیئے تا کہ رفتہ رفتہ لوگوں کو معلوم ہوجائے کہ یہ ہے کیا۔ میں Penguin Books (پینگوئین بکس) سے اس امکان پر بات کروں گا کہ جو مجلد ایڈیشن دستیاب ہیں ان میں اس بیان کا اضافہ کردیا جائے کہ اس کا مقصد

اسلام پر حملہ نہیں ہے"۔

یہ چیز کہ رشدی اس بات پر آمادہ ہو گیا کہ اس اوپر والے بیان کا اضافہ کر دیا جائے چاہے یہ عمداً تھا یا نہیں اس بات کا ثبوت ہے کہ ناول میں ایسا مواد تھا جو اسلام پر حملہ ہے۔ مضمون کا ایک اور حصہ چند تکلیف دہ سوالات اٹھاتا ہے۔ مضمون کے ایک حصہ کا تعلق اس کا چھ مسلمان علماء سے کرسمس کے موقعہ پر ملنا ہے تاوہ تردیدی بیان جاری کر سکے: "انہوں نے اس بات سے اتفاق کیا ہے کہ میں نے حقیقۃً گزشتہ پندرہ سالوں میں مسلمانوں کا طرفدار ہونے کا ثبوت دیا ہے خواہ یہ کشمیر کا معاملہ ہو، یا باقی ماندہ بھارت کا یا فلسطین یا برطانیہ کا۔ میں نے ہر قسم کی عصبیت کے خلاف مضامین لکھے اور ٹیلی ویژن پر اس کا اعلان کیا"۔

اگر وہ اپنے آپ کو ایسا شخص تصور کرتا ہے جس نے اسلام کے مقاصد کی بھرپور حمایت کی ہے تو پھر اس نے اسلام کے نام کو نقصان پہنچانے والا ناول شائع کر کے مسلمانوں کے اعتماد کو ٹھیس کیوں پہنچائی جن کیلئے وہ صدائے احتجاج بلند کر رہا تھا؟۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کا وہ دعویٰ جو اسلام کے لئے ہمدردانہ جذبات کی طرف اشارہ کرتا ہے وہ بالکل بے بنیاد ہے۔ اس کی تمام گزشتہ کتابوں میں جو بیس سال کے عرصہ پر محیط ہیں ان میں سے میں نے جو حوالہ جات پیش کئے ہیں وہ قطعی طور پر اسلام کیلئے اس کی نفرت ثابت کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اگر انسان رشدی کو شک کا فائدہ دے اور یہ مان لے کہ وہ واقعی سچا مسلمان ہے اور یہ کہ اس نے بعض دفعہ اسلامی عقائد کے دفاع میں آواز بلند کی ہے تو ہم کیسے یقین کر لیں کہ اس نے ایسی کتاب لکھی جس نے اسلام کے مقدس نام کو اس قدر نقصان پہنچایا جس نے ادبی تاریخ میں سب سے زیادہ بدنامی اور ناگواری پیدا کی۔

انسان اس بات پر یقیناً ورطہ حیرت میں پڑ جاتا اور بے چینی میں سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ہر قسم کے حقائق اس سازش کی طرف رہ نمائی کرتے ہیں جہاں کشمیر، ہندوستان اور پاکستان سے کہیں بڑے "سورماؤں" نے مل کر رشدی کی حمایت کی اور اس کے افسانے میں لفظوں کی ہیرا پھیری کے ادبی طریقے کو استعمال کیا تا وہ اپنے مقاصد حاصل کر سکیں۔ علاوہ ازیں اس کو اتنی دولت اور اتنی شہرت کے وعدے دئے گئے جو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ آ سکتے تھے۔

رشدی بیان کے ایک دوسرے حصہ میں اپنے ساتھی سازشیوں کے نام گنواتا ہے۔ جب وہ کتاب کو واپس نہ لینے کے ذاتی فیصلے کا دفاع کرتا ہے تو اس کے دل میں اقلیت کا مفاد مدنظر ہے نہ کہ پوری دنیا کے مسلمانوں کی اکثریت کا مفاد: "دی سٹینک ورسز" ایسا ناول ہے جو بہت سارے قارئین کی نظر میں قابل قدر ہے۔ میں ان سے دھوکہ نہیں کرسکتا"۔ اس کی شرافت کے کیا کہنے۔ وہ چند ایک لوگوں کے جذبات کا خیال رکھتا ہے بہ نسبت کروڑوں افراد کی تذلیل کے۔ رشدی کا باطن ظاہر و باہر ہوگیا ہے۔ اس نے دشمنانِ اسلام کے ساتھ غیر تحریری معاہدہ کرلیا تھا جن کو وہ دھوکہ نہ دے سکتا بلکہ دھوکہ دینے کی جرأت بھی نہیں کرسکتا تھا۔ رشدی ایسا بھگوڑا ہے جس نے ہاتھ آئے شکار کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ اس نے ذرا بھی پرواہ نہ کی کہ وہ دنیا کے مسلمانوں کے اعتماد کو ٹھیس لگائے گا جن کیلئے اس نے منافقانہ ہمدردی کا ڈھونگ رچایا تھا۔ انسان یقیناً سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ جیسے ایک پرانی کہاوت ہے رشدی جیسا جس کا کوئی دوست ہو اسے دشمن کی کیا ضرورت ہے؟

رشدی تمسخرانہ رنگ میں اپنے بیان کو ختم کرتے ہوئے تمام مسلمانوں سے اپیل کرتا ہے کہ وہ اس رفع نزاع کے طریق کار میں شامل ہوجائیں جس کی ابتداء ہوچکی ہے: "مجھے جس قدر اسلام کے بارہ میں معلوم ہے وہ یہ ہے کہ رواداری، رحمدلی اور محبت اس کا نقطہ معکوس ہیں"۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اب تک اس کی شائع ہونیوالی کتابوں میں اسلام کا پیغام اس کے نزدیک موجودہ بیان کی ضد رہا ہے۔ وہ شاید مسلمانوں کو احمق سمجھتا ہے جو اس کی متکبرانہ گذارش کو قبول کرلیں گے۔

وہ یہ بھی کہتا ہے کہ "دشمنی کی زبان کو محبت کی زبان میں بدل دیا جائیگا"۔ اس کی یہ خواہش کس قدر فضول اور واہیات ہے۔ جس چیز کو بدلنا ضروری ہے وہ ناول میں استعمال ہونیوالی گندی اور فحش زبان ہے۔ جب تک ایسا نہیں ہوتا بہت تھوڑے مسلمان چشم پوشی پر آمادہ ہوں گے تا اس کے ساتھ بامعنی تبادلہ خیال کیا جاسکے۔ اب یہ معاملہ مسٹر رشدی کے ہاتھوں میں ہے۔

جوں جوں وقت گذرتا گیا رشدی کا اضطراب بڑھنے لگا کیونکہ فتویٰ کے حکم میں دباؤ کم ہوتا نظر نہ آتا تھا۔ جلاوطنی میں جو وقت وہ گزار رہا تھا وہ اس کے لئے ناقابل برداشت بن گیا تھا۔ جو موقع اس کو نصیب ہوا اس نے اپنے نقطہ نظر کو بیان کرنے میں استعمال کیا۔ جس دوران مغربی

ذرائع ابلاغ اس کی پشت پناہی کررہے تھے اس نے ان مواقع سے پورا پورا استفادہ کیا۔ اس نے محسوس کیا کہ برطانوی حکومت نے اس کے ساتھ دھوکہ کیا یعنی انہوں نے اس کے کیس کو نظر انداز کر دیا تھا۔ اس امر کا اظہار اس نے برسر عام کیا تا وہ ہمدردی حاصل کر سکے۔ اس کو بخوبی علم تھا کہ برطانیہ جیسی طاقتور حکومت کے سایہ عاطفت میں رہ کر ہی وہ ذاتی حفاظت حاصل کر سکے گا۔

لندن کے سٹیشنرز ہال (Stationer's Hall) میں اس کو 14 فروری 1992ء کو تقریر کرنیکی دعوت دی گئی جو ترمیم کے بعد اگلے روز *The Times* اخبار میں "مجھے ہرگز فراموش نہ کر دیا جائے" کے عنوان کے تحت شائع ہوئی۔ یہ مضمون اس کی گویا ذاتی فریاد تھی کہ اس کو لگے ہاتھوں فروخت نہ کر دیا جائے: "میں برطانوی حکومت کے ساتھ حریفانہ تعلق نہیں رکھنا چاہتا کیونکہ اس نے مجھے تحفظ فراہم کیا ہے اور یہی میرے دکھ کے مداوا کی آخری امید ہے۔ لیکن میری خواہش ہے کہ حکومت میرے لئے یہ ماننا آسان کر دے کہ وہ پورے زور وشور اور عزم کے ساتھ میری طرفداری کرتی ہے"۔

اس کی دیدہ دلیری دیکھئے کہ وہ مخصوص مطالبات پیش کر کے حکومت پر زور ڈالتا ہے کہ: ایران کے ساتھ کوئی لین دین جس میں رشدی کے کیس کا کھلے عام اور مؤثر سمجھوتہ شامل نہیں کیا جاتا وہ قابل قبول نہ ہوگا"۔ شاید وہ اس قدر جرأت کے ساتھ حکومت سے اس لئے تقاضا کر رہا ہے کیونکہ اس کو قبل از وقت وعدہ دیا گیا تھا کہ حالات اس قدر سنگین نہ ہو پائیں گے جتنے کہ اب ہو گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ نام فراہم کرنے سے مجبور ہے۔

وہ پنجرے میں قید ایک بپھرے ہوئے زخمی جانور کی طرح تھا جس کو یہ علم نہ تھا کہ وہ اس دگرگوں حالت میں کیا کرے۔ اس کی ناتواں کوشش کہ اس کو مسلمان برادری میں دوبارہ شامل کر لیا جائے بری طور پر ناکام ہو گئی تھی۔ اسکے حلقہ بگوش اسلام ہونے کے پیچھے جو عیاری اور مکر چھپا ہوا تھا وہ سب نے بھانپ لیا تھا۔ یہ بات وثوق کے ساتھ اس کے ایک نایاب انٹرویو سے ثابت ہوتی جو رشدی نے دی ٹائمنز کی این میک الوائے (Ann McElvoy) کو دیا تھا اور جو 26 اگست 1995ء کو منظر عام پر آیا تھا۔ انٹرویو کرنیوالی خاتون کے الفاظ میں ہی اس انٹرویو کا پیش کرنا باعث دلچسپی ہوگا:

"ایک دفعہ اس نے اپنے دشمنوں کے ساتھ مصالحت کرنیکی کوشش کی۔1990ء میں کرسمس کے موقعہ پراس نے اسلام قبول کرلیا۔ یہ ایک ایسی چال تھی جس کووہ اب "میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی" قرار دیتا ہے۔اس کی پرورش ایک آزاد گھرانے میں ہوئی۔نوجوانی کی عمر میں اس نے اپنے دین کوترک کر دیا اوروہ اس دین کے ساتھ ایسا ثقافتی تعلق رکھتا ہے جو اگرچہ روحانی نہیں ہے۔اُس وقت میں The Stanic Verses کا دفاع ایسے شخص کی کتاب کے طور پرکررہی تھی جس کوواقعی اسلام کا گہرا علم تھا۔لیکن یہ غلط بیانی تھی میں خداپرایمان نہیں رکھتی اس لئے مجھے یہ کہنا ہی نہیں چاہئے تھا کہ ایمان رکھتی ہوں"۔

اس نے اپنی نجات کی امید انہی سازشیوں سے وابستہ کی جواس کواس گرداب میں دھکیلنے کے ذمہ دار تھے جس میں اب وہ بری طرح پھنسا ہوا تھا۔اس کے ساتھ وہ اپنی کتاب کے دفاع کی طرف بھی رجوع کررہا تھا:

"سٹینک ورسز ایک سنجیدہ ناول ہے۔ایک اخلاقی ناول ...... یہ نہ تو غلیظ نہ ہی بے عزت کرنیوالا اور نہ ہی مغلظات سے بھرپور...... یہ تو ورک آف آرٹ (مصوری کی تخلیق) ہے"۔

میں پوچھتا ہوں کہ ایک تخیلاتی ناول کوسنجیدہ اوراخلاقی کیسے کہا جاسکتا ہے؟اپنی تقریر میں اس نے ایک اور بیان دیا جو اپنے تابوت میں کیل ٹھونکنے کے مترادف ہے۔آزادی تقریر اور آزادی اظہار کا ذکر کرتے ہوئے وہ اپنا موازنہ اسلامی ممالک کے دوسرے ادیبوں سے کرتا ہے:

"ایک ممتاز سعودی ناول نگار سے اس کی شہریت چھین لی گئی اس کا کیا جرم تھا؟ وہ اسلام کا مخالف تھا۔ایک مصری ناول نگاراس کے پبلشر اور پرنٹر کو آٹھ سال کیلئے قید کر دیا گیا۔ان پر کیا الزام عائد کیا گیا؟ایک بار پھر ہتک خدااوررسول۔ یہ لوگ بھی اسلام کے مخالف تھے"۔

ان مسلمان ادیبوں کے ساتھ اپنا موازنہ کرکے وہ یہ تسلیم کرتا ہے کہ وہ ابھی انہی کی طرح مصیبت میں پھنسا ہوا ہے۔انجانے میں اس نے اپنے آپ پراسلام کا مخالف ہونے کا الزام عائد کرلیا جس کی وہ شروع ہی سے تردید کرتا آیا تھا۔

روپوشی میں جو وقت اس نے گزارا وہ اس کوشش میں لگا رہا کہ وہ پوری دنیا سے حمایت حاصل کرے تا بگڑتی ہوئی صورت حال کو بے اثر کردے جو قابل استہزاء اورخطرناک ہونے والی

تھی۔ مغرب کی ادبی دنیا سے اس کو بہت حمایت ملی جس کیلئے وہ آزادی تقریر اور آزادی اظہار کی علامت بن چکا تھا۔ روپوشی کے عرصہ میں اس کو مزید وقت مل گیا کہ مزید کتابیں تصنیف کر سکے جس کیلئے اس کو مدد مانگنے سے پہلے ہی مہیا تھی۔ جلاوطنی میں جانے کے بعد اس کی پہلی کتاب کا نام Haroun and the sea of stories (ہارون اینڈ دی سی آف سٹوریز) تھا جو 1990ء میں منظر عام پر آئی تھی۔

ہارون اینڈ دی سی آف سٹوریز

Haroun and the sea of stories

اس کے متعلق خیال یہی کیا جاتا ہے کہ یہ کتاب بچوں کیلئے ہے کیونکہ یہ لائبریری کے اُس حصہ کیلئے مخصوص تھی۔ کتاب کے پبلشرز ایک بار پھر پینگوئین والے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ انہوں نے رشدی پر یہ شرط ضرور عائد کر دی ہوگی کہ وہ ایک اور سانحہ کیلئے تیار نہیں ہیں جو رشدی کے گذشتہ ناول کی اشاعت کے بعد وقوع پذیر ہوا تھا۔ مزید یہ کہ وہ یعنی رشدی احتیاط برتے اور کم از کم وقتی طور پر اگلی کتاب اتنی اشتعال انگیز نہ لکھے۔

یہ ناول اتنا سودمند ثابت نہ ہوا جس کا سبب اقتصادی وجہ کے علاوہ یہ تھا کہ یہ 'فری ورلڈ' کے ادیبوں کیلئے ایک یاددہانی اور اپیل کے طور پر تھا کہ وہ رشدی کو انصاف ملنے کی مہم کو بدستور جاری رکھیں۔ عادت سے مجبور رشدی ایک اور جھوٹی بڑک مارتا ہے جب وہ کہتا ہے کہ اسلامی قانون آزادی فکر اور فرد کی آزادی کو محدود کرتا ہے۔ وہ اپنے روایتی طرزِ تحریر کو استعمال میں لاتے ہوئے افسانوی اصطلاحوں میں اپنا اصل مدعا چھپانے کی کوشش کرتا ہے لیکن ان میں مخفی اشارے بڑی آسانی سے سمجھ آ جاتے ہیں۔ مثلاً یہ کہنے کی کوشش میں کہ مسلمان اپنے حقیقی خیالات اور دلی احساسات بیان کرنے میں آزاد نہیں ہیں اور یہ کہ وہ غلامی کی زندگی گزار رہے ہیں اسلامی دنیا کی اس حالت کو بیان کرنے کیلئے وہ 'Chup city' (خموش شہر) کی ہندی اصطلاح استعمال کرتا ہے اور اس کے باسیوں (یعنی مسلمانوں) کیلئے 'بے زبان' کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔

دراصل رشدی جس دنیا سے تعلق رکھتا ہے وہ گپ سٹی کے سوا کوئی اور ہرگز نہیں جہاں

گپ شپ اور حماقت کا دور دورہ ہے۔ (رشدی کی ذرہ نوازی کہ اس نے ہندی الفاظ کے معانی بچوں کیلئے لکھی کتاب کے آخر پر دیے ہیں)۔ مزید برآں مجھے کامل یقین ہے کہ جب رشدی ناول کے مرکزی کردار راشد خلیفہ کے بارہ میں کچھ کہتا ہے تو وہ دراصل اپنے بارہ میں کہہ رہا ہوتا ہے جس کو "لینڈ آف گپ کا سب سے بڑا اعزاز یعنی the Order of the Open Mouth اس کی غیر معمولی خدمات کے عوض میں دیا گیا"۔ (صفحہ 192)

کتاب کے بارھویں باب میں جس کا عنوان ہے Was It the Walrus? رشدی آزادی تقریر کے حق کو موضوعِ سخن بنانے کیلئے ایک جعلی مقدمہ کا ذکر کر کے بڑی حسرت کیساتھ اپنی جدوجہد کی کامیابی کا ذکر کرتا ہے۔ اس نے اپنے لئے اور اپنے ساتھیوں کیلئے خاتمہ بالخیر کی امیدوں اور آرزوؤں کا اظہار بھی دوٹوک الفاظ میں کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے: "تم نے کہا تھا کہ یہ بہت بڑی خواہش ہوسکتی ہے اور یہ ہے بھی۔ میں ایک افسردہ شہر سے آیا ہوں جو اتنا افسردہ ہے کہ اپنا نام بھی بھول گیا ہے۔ میری خواہش ہے کہ تم اس کو مسرتوں والا انجام مہیا کرو نہ صرف میری جدوجہد کیلئے بلکہ سارے افسردہ شہر کیلئے بھی"۔ (صفحہ 202)

رشدی بار بار اس بات کا اعادہ کرتا ہے کہ وہ تمام اہل قلم کی آزادی تقریر کے حق کیلئے کوشاں ہے لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ اس کی تمام کوششیں ذاتی وجوہات کی بناء پر ہیں۔ جو لوگ ہیرو ہوتے ہیں ان کے چال چلن کیلئے جو معیار ہوتا ہے وہ ہرگز اس پر چسپاں نہیں ہوتا ہے۔ اس کی سابقہ بیگم میری این وگنز (Marianne Wiggins) نے رشدی پر اس موقعہ پر اعتراض کیا جب اس نے خطرے سے دوچار غیر معروف ادیبوں کی جدوجہد کی حسب استطاعت حمایت نہ کی اور نہ ہی نسلی برتاؤ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ میری این نے کہا: "ہم سب کی خواہش تھی کہ کاش یہ انسان اتنا عظیم ہوتا جتنا کہ یہ واقعہ تھا۔ یہ وہ راز ہے جس کو ہر کوئی چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ ہرگز عظیم انسان نہیں ہے"۔

(Anne McElvoy, *The Times*, August 26,1995)

میری این یقیناً یہ کہنے میں حق بجانب ہے کہ یہ راز دبیز پردوں میں پوشیدہ رکھا گیا ہے کیونکہ رشدی پر شہرت اور تعریف کے ڈونگرے ہر طرف سے برسائے جا رہے تھے۔ چونکہ اس کی

سابقہ کتابوں کی کچھ زیادہ ہی تعریف کی گئی تھی اس لئے ادب کے نقادوں کا متحدہ ٹولہ خود کو گراں بار محسوس کرتے ہوئے ناول کے معیار پر ضرورت سے زیادہ زور دیتا ہے۔ مثلاً ناول کے شروع میں متعدد حوالے دیئے گئے ہیں جن میں رشدی کی قابلیت کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہے۔: یہ کتاب ادب کا شاہکار ہے (Stephen King)۔ بہ حیثیت قلمکار، باپ اور شہری کے رشدی کا دل موہ لینے والا شیریں کلام (Edward Said, *Independent on Sunday*)۔ رشدی کی نرغے میں آئی ہوئی جان کی بازگشت کو خراج عقیدت (Anthony Burgess, *Observer*)۔ بچوں کی کلاسک کتاب۔ اس کا پہلا ایڈیشن سنبھال کر رکھو تا اس کو اپنے پوتوں کے لئے پیچھے چھوڑ جاؤ۔ (Victoria Glendinning, *The Times*)

لیکن میرے خیال میں ہندوستان کے رسالہ 'انڈیا ٹوڈے' کے ایک مبصر نے رشدی کی کتاب لکھنے کی اصل غرض یہ کہہ کر واضح کی ہے کہ: "یہ اس کے فن کی آزادی کا گن گانے والا دفاع ہے جس میں وقفہ وقفہ کے بعد گستاخانہ رنگ میں مسلمان سپاہیوں نے رکاوٹ پیدا کی ہے"۔ اس نکتہ کو بڑی شد و مد کے ساتھ *Sunday Telegraph* کے اے این ولسن (A.N. Wilson) نے دوبارہ یہ کہتے ہوئے پیش کیا کہ: "یہ کتاب ایسی دنیا میں جو پہلے سے زیادہ آزادی یا خیالات سے خوفزدہ ہے ایک جگ مگ کرتے چراغ کی طرح چمکتی ہے"۔ رشدی نے اپنے ''آرٹسٹ کے لائیسنس کا غنائیہ دفاع'' کو اپنے اگلے ناول میں جاری رکھا جس کا نام 'ایسٹ ویسٹ' *(East, West)* تھا جو 1994ء میں منظر عام پر آیا تھا۔

ایسٹ ویسٹ - *East, West*

یہ کتاب بھی بچوں کا ناول تھی۔ جیسا کہ اس کا عنوان بتلاتا ہے یہ مشرق اور مغرب کی کہانیوں اور حکایات کا مجموعہ ہے۔ وہ مشرق کے تمام وحشیانہ اور غیر مہذب رسم و رواج کو قلم بند کرتے ہوئے یہ تاثر دیتا کہ یہ وہاں کا عام رواج ہے۔ ایک حکایت میں جس کا نام "پیغمبر کا بال" *(The Prophet's Hair)* ہے اس میں اسلامی طریق نماز کا استہزاء کیا گیا ہے جیسے اس نے گزشتہ کتابوں میں کیا تھا۔ ہاں اس بار اس نے پیغمبر اسلام ﷺ کیلئے ہتک آمیز الفاظ استعمال

نہیں کئے ہیں۔ وہ نماز اور قرآن مجید کی تلاوت کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ بچوں کیلئے عقوبت نفس ہے۔ ایک نوجوان مسلمان بچے کی عمومی زندگی کی غلط تصویر کشی کر کے شاید وہ مغرب میں رہنے والے بچوں کو اسلام کی سچی تعلیمات کو جاننے سے باز رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کے برعکس ایک اور حکایت جس کا عنوان (Christopher Columbus and the Queen Isabella of Spain consummate their Relationship) 'کرسٹوفر کولمبس اور کوئین ازابیلا شب عروسی مناتے ہیں' ہے اس میں وہ جنسی قصے کو یوں سحر انگیز رنگ میں پیش کرتا ہے جس سے مصنف کے لاابالی پن کا پتہ چلتا ہے۔

یہ کتاب بچوں کیلئے ناول تھا مگر ستم تو یہ ہے کہ اس کی زبان نہایت مکروہ اور اخلاقی لحاظ سے گری ہوئی ہے۔ مثلاً ایک کہانی جس کا عنوان The Courtier (دی کورٹیئر) ہے رشدی نے چند ہی سطور میں ایف..."F" کا لفظ کم از کم دس دفعہ استعمال کیا ہے (صفحات 205-204)۔ غالباً ایسا آرٹ کے نام پر کیا گیا تھا!! ایسا لگتا ہے کہ سلمان رشدی نے ہمیشہ یہ یقین کیا تھا اور اب بھی یقین کرتا ہے کہ چونکہ اس کے پاس ایک قلمکار کا اجازت نامہ ہے اس لئے وہ جو چاہے سو کرے۔ چونکہ اس کو اعزازات سے نوازا جا رہا ہے، اس کی بے بہا تعریف کی جا رہی ہے اس لئے ہر وہ کتاب جو وہ لکھتا اس کے بعد اس کی انا غرور سے پھول جاتی ہے۔

اٹھارھواں باب

رشدی عوام میں آنا شروع کرتا ہے

جب ذرائع ابلاغ کیلئے 'رشدی افیئر' زیادہ اہمیت کا حامل نہ رہا تو سلمان رشدی نے رفتہ رفتہ ایسے مواقع تلاش کر لئے کہ اس نے ٹیلی ویژن پر آنا شروع کر دیا تا وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپیل کر کے ادیبوں کے آزادی تقریر اور آزادئ اظہار کے حقوق کیلئے اپنی جنگ جاری رکھ سکے۔ اس نے مغربی دنیا کے ممالک کے سفر شروع کئے تا کچھ نہ کچھ کامیابی سے ہمکنار ہو سکے۔ مثلاً ستمبر 1994ء میں اس نے بنگلہ دیش کی فیمنسٹ مصنفہ تسلیمہ نسرین کے ساتھ مل کر ناروے میں ایک سمپیوزیم میں شرکت کی جو خود اس کی طرح ناگوار صورت حال سے دوچار تھی۔ اس کے ایک ماہ بعد اسے جرمنی مدعو کیا گیا تا وہ یوروپین یونین کے وزرائے خارجہ سے ملاقات کر کے اپنے کیس کو مضبوط بنا سکے (اس ملاقات کو بھی مسلمانوں کی مخالفت سمجھا گیا تھا)۔

یکم اکتوبر 1994ء کو رشدی نے بی بی سی ٹو (BBC2) کے ٹیلی ویژن پروگرام Face to Face میں شرکت کی جس میں جیرمی آئزکس (Jeremy Isaacs) نے اس موضوع پر اس سے گفتگو کی کہ مصنفین کہاں تک کسی کی دل آزاری کرنے میں حق بجانب ہیں خاص طور پر *The Stanic Verses* کو مدنظر رکھتے ہوئے۔ باوجود اس کے کہ ایران کی طرف سے اسے قتل کی دھمکی مل چکی تھی رشدی اپنے کئے پر ہرگز نادم نہ تھا۔ بلکہ اس نے مصنفین کے اس حق کا بڑھ چڑھ کر دفاع کیا کہ ان کو متنازع امور کی چھان پھٹک کا حق حاصل ہے۔ اس نے کہا کہ " کسی کتاب سے بیزار نہ ہونے کا بہترین طریق یہ ہے کہ اس کو بند کر دیا جائے "۔ یہ خیال کتنا احمقانہ اور غیر معقول ہے۔ کیا وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ لوگوں کو شہوت پرستی اور بیت الخلاء میں کئے جانے والے کاموں کی کھلے بندوں اجازت ہونی چاہئے اور اگر آپ کو یہ برے لگیں تو اپنی آنکھیں بند کر لیں؟۔

رشدی نے کھلے بندوں پبلک میں تواتر کے ساتھ آنا شروع کر دیا لیکن 7 ستمبر 1995ء کو جب وہ عوام کے سامنے آیا تو اس کا اعلان 1989ء سے اس کی جلاوطنی کے بعد پہلی بار قبل از وقت کر دیا گیا۔ اس نے ایک مباحثہ میں شرکت کی جس کا نام The Times / Dillons debate - *"Writers Aganist the State"* تھا جو ویسٹ منسٹر سینٹرل ہال لندن میں اس کے ناول *The Moor's Last Sigh* کی اشاعت کے موقعہ پر منعقد ہوا تھا۔ اس نے مباحثہ کے دوران کھلم کھلا اس امر کا اعلان کیا کہ قلمکاروں کا ایک مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ جان بوجھ کر تنازعہ پیدا کریں اور ایسی بات کہیں جو کہی نہیں جا سکتی: "ہم مذہبی راہنماؤں کو اس بات کی اجازت نہیں دیں گے کہ وہ ہمیں حکم دیں کہ کب ہم منہ بند کر دیں۔ ہمارے فرضِ منصبی کا ایک حصہ یہ ہے کہ ہیجان اور ہلچل برپا کیا جائے ...... کسی بھی سوسائٹی میں ہیجان پیدا کرنا ہی ہمارا حقیقی فرض منصبی ہے۔"

(*The Times,* September 08, 1995)

درحقیقت یہی اس نے اپنے ناول *The Moor's Last Sigh* میں کیا ہے۔ جب دنیا اس کو سکھ کا سانس لیتے دیکھنا چاہتی تھی عین اس وقت اس نے ایک اور ہنگامہ برپا کر دیا۔ اس دفعہ اس نے ہندوؤں کو بھی ناراض کر دیا خاص طور پر شیو سینا کے صدر بال ٹھاکرے کو۔ شیو سینا بھارت کا سب سے زیادہ تشدد پسند مذہبی گروہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ ناول ایک کارٹونسٹ کے غیر یقینی سیاسی لیڈر بن جانے کا قصہ بیان کرتا ہے۔ لیڈر کی ٹھاکرے سے مشابہت جو مسلمانوں سے شدید نفرت رکھتا ہے ہر کسی کو معلوم ہے۔ ناول کو غلطی سے اسلام کا دفاع کرنیوالا بھی نہیں سمجھنا چاہئے بلکہ یہ امر حقیقت سے کوسوں دور ہے۔ ناول کے نفس مضمون کا تعلق مذہبی غیر رواداری سے ہے اور بنیادی طور پر رشدی کا نقطہ نگاہ بدلا نہیں بلکہ وہ ابھی تک اس سے متنفر ہے۔

ایسے محسوس ہوتا ہے کہ پرانا رشدی دوبارہ ظہور پذیر ہو رہا ہے جو پہلے سے زیادہ پرعزم ہے گویا کہ وہ ضائع ہونیوالے وقت کو واپس لا رہا ہو۔ وقت گزرنے کے ساتھ لگتا ہے اپنے مدعا کے اظہار کا خوف ایک بار پھر اس آزادی کو دوبارہ لو دیتا ہے جس کی اس نے *Midnight's Children* میں شیخی بھگاری تھی۔ مذکورہ ناول کے لکھنے کے بعد اس کو معلوم ہوا کہ ادب کے اظہار

کے ذریعہ اس کو کتنی طاقت حاصل ہوگئی تھی جس نے اس کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا کہ: "یہ حیران کن بات تھی کہ خوف کسقدر جلدی مجھ سے دور ہو گیا" (صفحہ 162)۔

پہلے سوچو پھر بولو اور کودنے سے پہلے سوچ لو ایسے محاورے ہیں جو شاید رشدی کی کھوپڑی میں کبھی نہیں آئے۔ اس کا کتابیں لکھنے کا نصب العین یہ رہا ہے کہ وہ شہرت کے پروں پر اڑتا رہے۔ اسکے اپنے الفاظ میں: "میں شاندار ناکامی کو معمولی سی کامیابی پر ترجیح دیتا ہوں" یہ بات اس نے *The Observer* کی رپورٹر خاتون کیٹ کیلا وے (Kate Kellaway) سے *The Waterstone Magazine* (Autumn 1995) میں کہی تھی۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ کیا اس نے کبھی کوئی ایسی بات کہی تھی جس کو کہنے سے قبل اس نے بار بار سوچا؟ اس کا احمقانہ جواب وہ یہ دیتا ہے: "اگر میں نے کبھی ایسا محسوس کیا تو میں لکھنا چھوڑ دوں گا۔ میرے دل میں ناول کے فن کا اس قدر احترام ہے کہ میں کبھی اپنی تحریروں کا نکتہ چیں نہ بنوں گا۔ اگر میں نے محسوس کیا کہ میں لکھنے سے ہچکچا رہا ہوں تو میں لکھنا بند کر دوں گا کیونکہ اعلیٰ ادب تلوار کی دھار کی طرح ہوتا ہے اور اگر آپ اس کے قریب جانے سے ڈرتے ہیں تو پھر آپ لکھنے کے اہل نہیں"۔

وہ زندگی میں تحفظ و سلامتی کو پسند کرتا ہے لیکن افسانے میں وہ اس کو نا پسند کرتا ہے: "میں کبھی بھی اس قسم کا مصنف نہیں رہا ہوں جو جان بوجھ کر خود کو غیر محفوظ جگہ پر لے جائے"۔ یہ کس قدر نا قابل یقین اور جھوٹا بیان ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ جلاوطنی میں رہ کر وہ اپنے حواس کھو بیٹھا ہے۔ تمام حقائق اس بات کی طرف نشاندہی کرتے ہیں کہ رشدی نے جانتے ہوئے عمداً خود کو اس ناگزیر صورت حال میں پھنسا لیا جس میں اس وقت گرفتار ہے۔ اس نے صرف صورت حال کی نزاکت کو نظر انداز کیا تھا۔

ایک اور بات جو اس نے کہی: "اگر انسان خطرہ مول نہ لے تو پھر انسان کوئی ہنگامہ خیز کام نہیں کرسکتا"۔ اس اصول کا اطلاق اس کی تمام کتابوں پر ہوتا ہے بشمول *The Moor's Last Sigh*۔ بظاہر اس چیز نے اس کو یہ حق دے دیا کہ وہ ہنگامہ کھڑا کرے چاہے اس کا انجام کچھ بھی ہو۔

رشدی کے ناول سے جس شدید ردعمل کا اظہار ہندوستان میں ہوا بلاشبہ وہ اس پر بہت خوش ہوگا خاص طور پر جس طرح ناول میں بال ٹھاکرے کو ایک ٹھگ کے روپ میں پیش کر کے اس کی

ناراضگی مول لی گئی۔ٹھاکرے کے حمایتیوں نے کہا کہ وہ کتاب کا نام ونشان مٹادیں گےاور جوکوئی اس کوفروخت کرنیکی جرأت کرے گا اس کو جان کے لالے پڑ جائیں گے۔ اس ناول سے وہی پرانا فتنہ کھڑا ہوگیا جو 'دی سٹینک ورسز' کی بازگشت ہے۔ پشیمانگی کی بات یہ ہے کہ بال ٹھاکرے ہندوستان کا ایسا معروف شخص تھا جس نے رشدی کی 'دی سٹینک ورسز' کی اشاعت پر حمایت کی تھی۔ اس وقت ٹھاکرے نے ہندوستان میں کتاب کے ضبط کئے جانے کی مذمت کی اور کہا تھا:

"آزادی تقریر کسی مذہبی گروہ کے جذبات سے زیادہ اہم ہے"

(*The Times,* September 03, 1995)

آزادی تقریر کے اصول کو انسان کتنی آسانی سے فراموش کردیتا ہے جب انسان کسی قلمکار کے زہریلے قلم کا خود نشانہ بن جاتا ہے۔ یہ امراور بھی تکلیف دہ ہے جب انسان سوچتا ہے کہ ایک شخص اسی ادیب کا دوسری کتاب لکھنے پر حمایتی تھا جس سے مصنف کی زندگی خطرے میں پڑ گئی تھی۔ لیکن انسان ایسے مصنف کے دوغلے کردار کا سوچ کر ذرا بھی دنگ نہیں ہوتا جو ہر قسم کے اخلاقی اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر صرف اپنے مفادات کو بچانے کیلئے کوشاں تھا۔

رشدی کیلئے نوبل پرائز

رشدی کو ایک بار پھر سے ''ہلچل اور ہیجان'' پیدا کرنے پر ایک اور بوکر پرائز ملنا تھا جس کا وہ ادبی نقادوں کے نزدیک زیادہ اہل تھا۔ واٹرسٹون میگزین کے اینڈی ملر (Andy Miller) کے نزدیک "بوکر پرائز اس نے شرطیہ جیت لینا ہے"۔ لیکن *The Times* کے گائی والٹرز (Guy Walters) نے اس خدشہ کے پیش نظر کہ اس کو تیسرا بوکر پرائز ملنے والا تھا رشدی کا رتبہ بڑھا چڑھا کر پیش کیا: "ایک دفعہ بوکر پرائز حاصل کرنا شاید چالاکی سمجھا جائے، دو بار جیتنا نہایت ذہین ہونا قرار پائے اور تین بار جیتنا دیوتا ہونے کے مساوی ہوگا"۔

(*The Times,* October 05, 1995)

رشدی کو 1994ء میں انٹرنیشنل پارلیمنٹ آف رائٹرز کا صدر چنا گیا۔ یہ بین الاقوامی اعزاز اس کو کثیر تعداد میں پہلے سے ملنے والے اعزازات وتمغوں میں اضافہ تھا۔ تیسرے بوکر پرائز ملنے کے بعد اس سے اگلا مرحلہ رشدی کی شہرت کو بام عروج تک پہنچنے میں لٹریری فکشن میں نوبل

پرائز کا ملنا رہ گیا تھا۔لیکن ججوں کو تنبیہہ کر دینا ضروری ہے۔رشدی شکست کو عالی ظرفی سے قبول نہیں کرتا۔*The Times* کے لٹریری ایڈیٹر فلپ ہاورڈ (Philip Howard) نے اس کے ناول '*Shame*' کی ناکامی کے بعد ہونیوالے ہنگامہ کا ذکر کیا جبکہ ہر کوئی پہلے سے کہہ چکا تھا کہ یہ ضرور بوکر پرائز جیتے گا: "اس *Shame* کے بوکر پرائز جیتنے کے امکانات موجود تھے۔ جب اس کو انعام نہ دیا گیا تو رشدی کے دل کو سخت ٹھیس پہنچی۔ وہ اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور آنے جانیوالے لوگوں اور ججوں سے بدکلامی شروع کر دی"۔

(*The Times,* February 15, 1989)

شاید یہ رشدی کا شہرت اور عزت کیلئے شدید ہیجانی خواہش اور شوق تھا جس نے اس کو اسلام کے مخالف یہودی ونصرانی سازشیوں کا منظورنظر بنا دیا تھا۔ان لوگوں نے اس کو اپنی سرپرستی میں لے لیا اور رفتہ رفتہ اس کی ایسے رنگ میں پرورش کی تا وہ اسلام کے خلاف خبیثانہ اور سنگدلانہ صلیبی جنگ کا حصہ بن جائے اور اسلام کے نورانی نام کو مزید بدنام کر کے اس کا حلیہ بگاڑ دیا جائے۔ جب رشدی اپنے ناول '*The Moor's Last Sigh*' پر بوکر پرائز نہ جیت سکا تو اس کو سخت مایوسی ہوئی۔ اس کے باوجود اس کے حواریوں سے اس کو بہت حوصلگی ملی جیسے Auberon Waugh جو '*The Literary Review*' کا ایڈیٹر تھا۔اس نے کہا کہ ایک شخص "جس کا تعاقب مذہبی جنونیوں نے زمین کے ایک کونے سے لیکر دوسرے کونے تک کیا ہے اس کو لازماً کامیابی سے ہمکنار ہونا چاہئے" (*The Times*, November 1995)۔ واہ کے اس حقیقت کا اعتراف کہ اس نے رشدی کے ناول کا مطالعہ تک نہ کیا تھا اس سے اس کو ملنے والی پُر جوش حمایت کی بیہودگی کا پتہ چلتا ہے یعنی رشدی کو محض آزادی تقریر کے نام پر انعام دیدیا جائے۔

رشدی کو اس بات کے لئے بھی تیار رہنا چاہئے کہ اگر اسے نوبل پرائز مل جائے تو اس کو اسے اپنے سازشی ساتھیوں میں بانٹنا ہوگا کیونکہ انہی کی وجہ سے تو وہ ایک اہم شخصیت بن سکا ہے۔ شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ اس چیز کی امید ایسے شخص سے وابستہ نہیں کرنی چاہئے جس کی زندگی کا واحد مقصد خود کو امیر اور طاقتور بنانا رہا ہے۔ یہ حقیقت بھی روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ رشدی

اپنی ذات پر لگنے والے الزامات کیلئے دل گردہ نہیں رکھتا جبکہ وہ دنیا کے ہر قلمکار کیلئے آزادی تقریر کا نعرہ بلند کرتا ہے۔ میں اس اصول میں پائے جانے والے تضاد کی اب وضاحت کروں گا جس کیلئے بڑی تند مزاجی کے ساتھ رشدی معرکہ آرائی کرتا چلا آرہا ہے۔

مصنّف کو کس نے مارا؟

یہ بات نمایاں طور پر واضح ہے کہ رشدی اور اس کے ادبی دنیا میں حمایتی کسی مصنّف کی تحریر کی حدود اور حدود سے باہر آزادی کے موضوع کو کچھ زیادہ ہی طول دے رہے تھے۔ مثلاً رشدی نے اس موضوع پر خود جو بیان دیا وہ قابل غور ہے: "انسانی حقوق کی فہرست میں آپ کہیں بھی اس حق کا ذکر نہ پائیں گے یعنی جذبات کو ٹھیس نہ لگانے کا حق۔ اگر ایسا کوئی حق ہوتا تو پھر ہم سب کے ہونٹ سی دئے جاتے۔ کسی آزاد معاشرہ میں دل آزاری کرنا کبھی بھی پابندی کی وجہ نہیں ہونا چاہئے"۔
(*The Times,* February 15, 1992)

لیکن ایک تخیلاتی ڈرامہ جس میں رشدی کی موت کو فرض کر لیا گیا اس پر رشدی کا شدید ردعمل خود غرضی کی مثال اور اس اصول کے عین متضاد تھا جس کیلئے وہ فتویٰ جاری ہونے کے بعد سے معرکہ آرائی کرتا آرہا تھا۔ ڈرامہ کے مصنف برائن کلارک (Brian Clark) نے ایک ڈرامہ *Who Killed the Writer?* ("مصنّف کو کس نے مار ڈالا؟") کے عنوان سے لکھا۔ یہ فتویٰ کے بعد لکھا گیا تھا تا مصنّفین ہر قسم کی حمایت کا اظہار کر کے اس واقعہ سے سبق سیکھیں۔ وہ ایک قاتل اور سیاسی صحافی کے مابین ہونیوالے جھگڑے کے ذریعہ یہ بتلانا چاہتا تھا کہ "اگرچہ آیت اللہ خمینی کی طرف سے رشدی کی مذمّت دنیا کے کسی بھی نظام میں جس کو ہم برداشت کر سکتے ہیں شر انگیز اور ناقابل قبول تھی لیکن ایسا یونہی نہ ہوا تھا۔ مغربی طاقتوں نے اس عفریت کو خود دودھ پلایا جو اب ہم سب کو زندہ نگل جانے کی دھمکیاں دے رہا ہے"۔

قبل اس کے کہ عوام الناس کو اس ڈرامے کی خبر ملتی برائن کلارک نے جو خط اپنے ڈرامے کی نقل کے ساتھ سلمان رشدی کو بھجوایا تھا یہ اس کے پہلے صفحہ سے اقتباس ہے۔ اس نے رشدی کو یقین دہانی کرائی کہ: "اگرچہ میں تمہاری رنجیدہ اور ناگوار صورت حال کو استعمال میں لایا ہوں تاہم میں نے اس کا استحصال نہیں کیا ہے...... مجھے ڈرامے سے صرف ایک توقع تھی اور وہ یہ کہ اسلامی

بنیاد پرستی کی بحث کو وسیع تر کرتے ہوئے میں یہ کوشش کروں کہ دنیا میں موجود تناؤ کو ممکن ہو تو کم کیا جائے"۔

یہ ایک ہمدم دیرینہ اور ہم پیشہ مصنّف کی طرف سے دلجوئی اور نیک جذبہ کا اظہار تھا لیکن رشدی نے اس کا جو جواب دیا اس سے ایک بار پھر اس کا سرکش اور خود غرضانہ کردار منکشف ہو گیا۔ برائن کلارک نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا: "مسٹر رشدی نے میرے خط کا جواب یوں دیا کہ اس نے میری فون آنسرنگ مشین پر یہ پیغام چھوڑا کہ اس کو اس بات پر سخت دھچکا لگا ہے کہ میں نے یہ کیسے سوچ لیا کہ ایک ایسا ڈرامہ جس میں اُس کی موت کو فرضی طور پر پیش کیا گیا۔ وہ اُس کو کسی طور سے قابل قبول ہوگا۔ اور یہ کہ اس ڈرامے کے کئے جانے میں وہ رکاوٹیں پیدا کریگا"۔

بعد ازاں برائن کلارک ایک دوسرے خط کے ملنے پر انگشت بدنداں رہ گیا جو اس کو رشدی کے ایجنٹ نے بھیجا تھا۔ اس میں لکھا تھا اگر ہم ڈرامے کی پروڈکشن کرنیکا ارادہ رکھتے ہیں تو ہم اس کو تحریری اطلاع دیں تا وہ سلمان رشدی کے قانونی حقوق کی نگہبانی کر سکے۔ برائن کلارک نے اس ڈرامے کو سٹیج نہ کرنیکا فیصلہ کر لیا مگر اس کے باوجود اس کو رشدی کی طرف سے ایسا کوئی خط نہ آیا جس میں اس نے اس تلطّف کا ذکر کیا ہو۔ برائن کو اس کے بعد احساس ہوا کہ اس کا اپنے ڈرامے پر پابندی لگانے کا فیصلہ غلط تھا۔

انصاف پسند لوگوں کی اکثریت برائن کلارک کے اس دعویٰ سے اتفاق کرے گی جب وہ قیاس آرائی کرتا ہے کہ: "رشدی کی ستم ظریفی دیکھیں جب وہ تقاضا کرتا ہے کہ ایک ڈرامے کو محض اس لئے منسوخ کر دیا جائے کیونکہ اس سے وہ دلگیر ہوا ہے یہ امر اتنا واضح تھا کہ جلد ہی مجھے احساس ہو گیا کہ وہ سوچنے کی اہلیت سے یکسر معذور ہو چکا ہے"۔

حقیقت تو یہ ہے کہ رشدی اپنے ادبی پیشہ کے شروع ہوتے ہی سوچنے کی اہلیت سے معذور ہو گیا تھا۔ اس کی بصیرت شہرت اور دولت کے سیاہ بادلوں کے چھا جانے سے دھندلا گئی اور The Stanic Verses کی اشاعت پر یہ اوج کمال کو پہنچ گئی۔

اٹھارھواں باب

حرف آخر

قارئین کرام! یہ کتاب جو آپ کے ہاتھوں میں ہے یہ دس سال قبل 1997ء میں شائع ہوئی تھی۔اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ اس کے شائع شدہ حرف آخر پر نظر ثانی کی جائے تا یہ دیکھا جاسکے کہ اس عرصہ میں کیا کچھ رونما ہوا ہے۔ بلاشبہ جہاں تک اسلام اور مغرب کا تعلق ہے اس عرصہ میں اتنے واقعات رونما ہوئے ہیں کہ ان کا ذکر سیبوں سے لدی ہوئی گاڑی کو دھکا دینے کے مترادف ہوگا۔ واقعات اتنے بے شمار ہیں کہ کسی ایک واقعہ یا حادثہ پر توجہ مرکوز کر دینا مشکل معلوم ہوتا ہے۔

جہاں تک کتاب کے متن کا سلمان رشدی سے تعلق ہے اس کو ٹیکس ادا کرنے والے شہریوں کے خرچہ پر حکومت نے دن رات کے چوبیس گھنٹے حفاظت مہیا کی ہوئی تھی۔ اس کو اس بات کی بھی اجازت تھی کہ وہ مضامین لکھتا رہے، مزید کتابیں شائع کرتا رہے، اور پہلے سے بڑھ کر عوام الناس سے مخاطب ہوتا رہے۔ کچھ ہی عرصہ قبل اس کو مشہور زمانہ ٹیلی ویژن بی بی سی کے پروگرام Question Time میں بطور مہمان آنے کی دعوت دی گئی تھی۔ اس پروگرام میں اس نے ایک بار پھر اسلام کا مذاق اڑایا اور دعویٰ کیا کہ یہ مذہب ایک بار پھر تعصب کی گہرائیوں میں گرتا جا رہا ہے۔ اس نے برطانیہ میں مسلمان لیڈروں کو نشانہ تضحیک بناتے ہوئے کہا کہ " ان لیڈروں کی بات کوئی بھی نہیں سنتا۔ مسلمان کمیونٹی کی نمائندگی کے لئے یہاں کوئی ایک بھی تنظیم نہیں ہے"۔ (ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ اس کے اس بیان میں کچھ صداقت ضرور ہے۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ ایسے تمام مسلمان جو ایک مسیح اور مہدی کے نزول کے انتظار میں امید سے ہیں وہ بالکل گمراہ ہو چکے ہیں۔ ان کو ایک متحدہ آواز اور ایک لیڈر کی ضرورت ہے جو ان کے جذبات کی نمائندگی کر سکے)۔

جب میری کتاب *'Rushdie: Haunted by his unholy ghosts'* منظر عام پر آئی تو اس کے حرف آخر میں راقم الحروف نے رشدی کو یہ مشورہ دیا تھا کہ اس کے لئے یہ مناسب ہوگا کہ اب اس کو 'فراموش شدہ' انسان سمجھا جائے۔ کچھ عرصہ کے لئے وہ واقعی زیر زمین چلا گیا اور اس کے بارہ میں پریس اور ذرائع ابلاغ میں بمشکل ہی کوئی خبر آتی تھی۔ یہاں تک کہ 1998ء میں اس پر لگے فتویٰ کو بھی اٹھا دیا گیا۔ مگر کیا اس کی انانیت اس کو شہرت سے دور رہ کر خوش دیکھ سکتی تھی؟ ہرگز نہیں۔ ایک ایسا آدمی جس نے شہرت اور پیسے کی تمنا میں اس قدر تگ و دو کی تھی اور جو شہرت اور پیسے کا مزہ لوٹ چکا تھا، یہ ایک ایسی بات تھی کہ اس کے لئے لمبے عرصہ تک اس سے باز رہنا مشکل امر تھا۔

رشدی نے ایک بار پھر ذرائع ابلاغ کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانا شروع کی۔ مگر اس دفعہ اس نے میڈیا میں اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے مسلمانوں کو مشورہ دینا چاہا کہ اسلام کو کس طرح ماڈرنائز کیا جا سکتا ہے، تا جدید رجحانات کو قبول کیا جا سکے خواہ اس کے عوض اسلام کے بنیادی عقائد اور اصولوں کو قربان کر دیا جائے۔ اس نے پریس میں اپنا اثر و رسوخ استعمال کرنے کی کوشش کی اور مسلمانوں کی 'خاموش اکثریت' کو تشدد پسند لوگوں سے مقابلہ کرنے پر ابھارا تا کہ مسلمانوں میں خانہ جنگی شروع ہو جائے۔

(*The Times*, London, August 28, 2005)

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ مزعومہ بنیاد پرست تحریک کو رشدی افیئر کے بعد لبرل مسلمانوں میں جڑیں پھیلانے کا موقعہ ملا تھا اور یہ کہ اس کے نتیجہ میں ایسے بین الاقوامی حادثات رونما ہوئے جنہوں نے اسلام کے تصور کو بری طرح مسخ کیا تھا۔ بدنام زمانہ واقعات میں سے 9/11 اور اس کے بعد 7/7 کے جو نیویارک اور لندن میں واقعات ظہور میں آئے ان کے بعد اسلام اور مغرب کے مابین مصالحت کے جو کچھ امکانات تھے وہ بالکل معدوم ہو گئے۔ سلمان رشدی نے اس میں اپنا رول پوری طرح ادا کیا تا اس کے آقاؤں کے عزائم و مقاصد کو ہر صورت میں پایہ تکمیل تک پہنچایا جا سکے۔

اگرچہ اس نے ان مذکورہ سانحوں سے اپنے آپ کو دور رکھا تاہم اس نے کچھ حیلوں بہانوں

سے کوشش کی کہ وہ تاریخ کے چند اوراق کو بدلنے میں اپنے آپ کو وابستہ کر سکے۔اس کی کتاب The Stanic Verses کی اشاعت کے بعد اسلام اور مغرب کے مابین جو سلگتی ہوئی آگ بھڑک اٹھی تھی اس کے خلاف فتویٰ اٹھا لئے جانے کے بعد وہ مدھم ہونے لگی۔ تاہم رشدی اس تگ ودو میں لگا رہا کہ دنیا کی توجہ اس پر مرکوز رہے چاہے اس کے عواقب کچھ بھی ہوں۔ وہ بجھتی ہوئی آگ کو پھر سے بھڑکا تا آرہا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ اپنی کہانی کو ان واقعات کا پیش خیمہ سمجھتا ہے جن میں سے ہم اس وقت گزر رہے ہیں۔

رشدی نے کہا کہ "جب لوگوں نے اوّل اوّل مجھ میں اور 9/11 میں ناطہ قائم کرنا چاہا تو میں نے اس سانحہ کے اتنا بڑا ہونے کی وجہ سے تردید کی تھی۔ لیکن اب مجھے احساس ہونے لگا ہے کہ جو کچھ میری کتاب 'دی سیٹانک ورسز' کے ساتھ ہوا وہ گویا پیش آئند واقعہ کا نمونہ تھا اور یہ کہ اب ہم بڑے واقعہ میں آن پڑے ہیں"۔ اس نے مزید کہا "اس وقت اس واقعہ کو کسی بڑے واقعہ کا چھوٹا نمونہ سمجھنے میں لوگوں کو تذبذب تھا۔ جو لوگ مجھ پر حملے کر رہے تھے وہ کہنا چاہتے تھے کہ اس واقعہ سے کسی بڑے واقعہ کا سلسلہ نکالنا غلط ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ رشدی نے خاص قسم کا مکروہ کام کیا تھا اس لئے وہ اس کے ناخوشگوار انجام کا بھی مستحق تھا"۔

"اور حتّٰی کہ میرا دفاع کرنے والے لوگ کہنا چاہتے تھے کہ یہ ایک ادیب پر ناخوشگوار حملہ ہے۔ لیکن میں یہ کہنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ایسا سلوک ادیبوں سے پوری دنیا میں ہو رہا ہے۔ لیکن جو کچھ میرے ساتھ ہوا وہ اب کہانی نہیں ہے، اب کہانی کا رُخ بدل گیا ہے، میرے خیال میں The Stanic Verses کے بارہ میں کوئی بھی توجہ نہیں دیتا"۔

(*The Times*, September 2005)

اگر اس کی کتاب کو کوئی توجہ نہیں دیتا تو پھر اس نے ایڈنبرا انٹرنیشنل ٹیلی ویژن فیسٹیول منعقدہ اگست 2005ء کے موقعہ پر اعلانیہ طور پر کیوں کہا تھا کہ The Stanic Verses چھوٹے ڈرامہ کی صورت میں ٹیلی ویژن پر دکھائی جائیگی اور یہ کہ ٹیلی ویژن کے حقوق ابھی تک دستیاب ہیں۔ اس نے اس بات کی بھی تصدیق کی تھی کہ فرانسیسی زبان میں بھی اس کتاب کو فلمائے جانے کا پراجیکٹ زیر غور ہے۔

اس فیسٹیول کے موقعہ پر رشدی کی لیبر پارٹی کے ممبر آف پارلیمنٹ جارج گیلا وے (George Gallaway) کے ساتھ 28 اگست 2005ء کو ٹیلی ویژن پر ایک مباحثہ بعنوان 'ٹی وی اور مذہب' کے دوران کھٹ پٹ ہوئی تھی۔ اس نے مباحثہ میں پورے جوش سے دلائل دئے کہ اسے اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ جو چاہے سو کہے۔ رشدی اس فیسٹیول کے موقعہ پر اپنے نئے ناول کی تشہیر بھی کر رہا تھا۔ پہلے کی طرح رشدی نے اسلام اور مغرب کے تعلقات کو متاثر کرنے والے حادثات پر غور کرنے کے لئے مزعومہ فرضی ناول لکھا تھا۔ اس کا تازہ ناول '*Shalimar the Clown*' جدید دور کی دہشت گردی کے متعلق ہے اگر چہ وہ اس کی تردید کرتا ہے۔ اس نے یہ کہہ کر اپنی بے حیائی کا ثبوت دیا ہے کہ اگر چہ وہ کبھی بھی کسی ٹریننگ کیمپ میں نہیں گیا تاہم چونکہ وہ فتویٰ کی دھمکی کے زیر اثر (1989 سے لے کر 1998ء) رہ چکا تھا اس لئے اس کے پاس کافی وقت تھا کہ ایسے لوگوں کی ذہنیت جان سکتا جو وہاں جا چکے ہیں"۔ واقعی اس کی قابلیت کی کوئی حد نہیں !!۔

'شالیمار دی کلاؤن' کی کہانی مختلف براعظموں پر محیط اور اس کا زمانہ دوسری جنگ عظیم سے لے کر ماڈرن امریکہ اور جہادی ٹریننگ کیمپ تک ہے۔ یوں شاطرانہ طریق سے 9/11 اور اس کے عرصہ کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ اپنی نئی کتاب پر بحث کرتے ہوئے وہ اپنی تردید خود کرتا ہے جب وہ کہتا ہے کہ "دراصل آپ کو کرنا یہ ہے کہ ان لوگوں کے دماغ کے اندر گھسنے کے لئے تصوراتی چھلانگ لگانی ہے" (دی ٹائمز ستمبر 2005ء)۔ اس نے یہی دلیل 'دی سیٹنک ورسز' لکھنے پر پیش کی تھی۔ وہ ابھی تک اس مغالطے میں ہے کہ اگر آپ کسی چیز کو فرضی کہہ دیں چاہے وہ اصلی لوگوں اور واقعات سے مشابہ ہو تو اس قسم کی کتاب کو ادب کا من گھڑت کام سمجھا جائے گا (اور اسے بوکر پرائز کا بھی حق دار سمجھا جائیگا)۔

رشدی تاریخی واقعات کو بڑے عیارانہ طریق سے اپنے ناول لکھتے وقت استعمال کرتا ہے مثلاً: '*Midnight's Children*' کا تعلق ہندوستان اور پاکستان کی تقسیم سے ہے۔ 'دی جیگوئر سمائیل' *The Jaguar Smile* کا تعلق نکا را گوا کے ڈکٹیٹر سوموزا کے خلاف سیڈ انسٹاس کی حمایت میں ہے۔ لیکن جہاں تک اسلام کا تعلق ہے تو پھر افسانوی دنیا دھوکے، فریب

اور کینہ پروری میں بدل جاتی ہے جو کہیں اور استعمال نہیں کی جاتی بلکہ اس کو محض اسلام کے پیروکاروں کے لئے مختص رکھا جاتا ہے۔نئی کتاب کا تناظر یہ ہے کہ دنیا کو دہشت گرد کی آنکھوں سے دیکھا جائے اور اس کوشش میں اس نے عمداً اپنے آپ کو اس دہشت گرد کا نشانہ بنانے کی سعی کی ہے۔جیسا کہ اس نے The Times اخبار میں لکھا کہ:"اگر تاریخ کے اس دور میں آپ ایک انشا پرداز ہیں تو آپ کو اس سے لڑنا ہے جو سامنے ہے، اور یہی ہمارے عہد کا موضوع سخن ہے۔ آپ ہر موڑ پر اس سے ٹکراتے ہیں، اگر یہ پسند نہیں تو پھر کتابیں مت لکھو" (ستمبر 2005ء)۔

دراصل اس کو تنازعہ کا کیڑا لڑ گیا ہے اور اس نے اپنا کردار اس کا مقصد حیات بنالیا ہے۔

'دی سٹینک ورسز' لکھنے کی اصل وجہ

اپنے اوپر عائد کردہ جلاوطنی سے واپس آنے کے بعد رشدی نے اپنا ننگا پن سپیشل برانچ کے ان خاص آدمیوں کے بغیر ضرور محسوس کیا ہوگا جو اس کی روزمرہ زندگی کا اب حصہ نہیں رہے تھے۔ لیکن زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ اس نے پھر سے شور وغل برپا کرنا شروع کر دیا کہیں خدانخواستہ لوگ اس کو بھول تو نہیں گئے۔جس طرح قاتل موقعہ واردات کی طرف لازماً لوٹ کر آتا ہے اسی طرح رشدی سے رہا نہ گیا کہ وہ ان وجوہات کا ذکر کرے جن کی بناء پر اس نے بدنام زمانہ کتاب 'دی سٹینک ورسز' لکھی تھی۔قاتل کی مثال کی طرح سچ رفتہ رفتہ باہر آنا شروع ہوا، رشدی بار بار مداخلت کرتا رہا جیسا کہ اس کے ذرائع ابلاغ کو دئے گئے بیانات سے واضح ہوتا ہے۔

سچ تو شروع ہی میں ظاہر و باہر ہو گیا تھا جب اس نے پہلا ناول' گریمس' Grimus تحریر کیا تھا جو تجارتی نقطہ نظر سے زبردست ناکامی تھا۔اس نے اپنے نقادوں کو نہ تو معاف ہی کیا اور نہ ہی فراموش۔جب اس کے اگلے ناول 'مڈنائٹس چلڈرن' Midnight's Children نے راتوں رات کامیابی کے قدم چومے تو ادیبوں کی برادری نے اس پر داد و دہش کے ڈونگرے برسادئے یعنی اس کو 'بوکر پرائز' دیا گیا۔رشدی نے انعام قبول کرتے ہوئے اپنی تقریر میں ناول پر تنقید کرنے والوں کی وہ درگت بنائی کہ اس تقریر کو سب سے گھٹیا تقریر قرار دیا گیا۔خود غرض، خود بین، شیخی باز، ریاکار چاہے آپ اس کو کچھ بھی کہہ لیں لیکن یہ دراصل "بطور گستاخ، غیر دلکش انسان

کے یہ اس کی شہرت کی عمارت کی بنیادی اینٹ تھی "۔

(G. Dougry, The incredible lightness of Salman, *The Times, September 2005*)

وہ ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ اس کو کسی بھی صورت میں نشانہ تنقید بنایا جائے۔ یہ بات یوں ثابت ہوتی ہے جس طرح کی تنقید وہ دوسروں پر کرتا ہے۔ مثلاً رشدی نے ایک مصنف پال سکاٹ کی کتاب "راج کوارٹٹ" Raj Quartet" پر نقادانہ رائے کا اظہار کیا اور یہ کہنا چاہا کہ ہندوستان کے متعلق صرف ایک زاویہ سے لکھا جا سکتا ہے۔ یعنی اگر مصنف کا نقطہ نظر رشدی کے طے کردہ اصولوں سے مطابقت نہیں رکھتا تو یہ قابل قبول نہیں ہوسکتا۔ جس طرح کہ ہم سب جانتے ہیں اس کے بعد جس طرح پردہ اخفا اٹھا یہ دی سٹینک ورسز کا مصنف اور اس کے حامی تھے جنہوں نے یہ دلیل پیش کی کہ ایک جمہوری معاشرہ میں آزادی پر رحم وعفو کی طرح کوئی پابندی نہیں ہوسکتی۔ کسی ادیب کو کسی بھی موضوع پر کسی بھی نقطہ نظر سے اظہار خیال کی اجازت ہونی چاہئے، خواہ اس سے کسی کا دل دکھے۔"

(G. Dougry, The incredible lightness of Salman, *The Times, September 2005*)

اس کی کتابوں کے ناقدین کے پیش نظر اس کے اعتراض پر ایک اور دلچسپ نکتہ سامنے آتا ہے۔ یہاں اس کے اعتراض پر پوری توجہ سے غور فرمائیں۔ جب اس سے اس کی انشاپردازی کے اولین دور میں استفسار کیا گیا تو اسے یاد آیا کہ اس کے غصے کی وجہ اس کے پہلے ناول 'گریمس' (Grimus) کے بارے میں لوگوں کا ردعمل تھا۔ لوگ کہہ رہے تھے کہ 'جاؤ کوئی اور ذریعہ معاش تلاش کرو۔۔' مجھے یہ بات اچھی طرح یاد ہے۔ اور اب میں گذرے وقت پر غور کرتا ہوں تو کہتا ہوں کہ چوٹ کے بدلے چوٹ لگانے کی کوشش مت کرو کیونکہ تم ہی نقصان اٹھاؤ گے"۔ شاید اتنا وقت گزرنے کے بعد اس کو احساس ہوا ہے کہ وہ مصنّفین کی برادری کے سامنے اپنا کیس عمدہ طریق سے پیش نہیں کر سکا۔ لیکن قسمت میں شاید یہی لکھا تھا اس قسم کی جرأت جس کا اس نے اظہار کیا، اس سے وہ ان طاقتوں کی نگاہ میں آ گیا جنہوں نے اس کو آخر کار قربانی کا بکرا بنا دیا (جس کے لئے وہ برضا و رغبت حاضر تھا)۔

اس بارہ میں رشدی خود کہتا ہے: " کچھ قسم کی بے خوفی اس فیصلہ میں مضمر تھی کہ مقابلہ پر ڈٹ جاؤں۔ پہلی کتاب کی ناکامی کے بعد اور پھر اس کے بعد دو ایک اور بے سود کوششوں یا چیزوں

کے جو اشاعت کے مرحلہ تک نہ پہنچ سکیں، مجھے یاد ہے میں نے یہ سوچنا شروع کیا کہ بہتری اسی میں ہے کہ یا تو ہار مان لوں یا پھر اس سے رجعت پسندانہ یا مڈل آف دی روڈ یا ایسی چیز جس میں خطرہ زیادہ نہ ہو یعنی آپ جانتے ہی ہیں کہ اس سے کم ترین کام کروں۔ یا پھر اگر ہمت ہے تو اس سے بڑا خطرہ مول لوں۔ تاکہ اگر کشتی ڈوبنے ہی لگی ہے تو پھر شعلوں کی زد میں بھسم ہو جاؤں۔ مجھے خوب یاد ہے میں نے فیصلہ کیا کہ میں یہی کروں گا کیونکہ میں اس کے علاوہ اس سے زیادہ کسی خطرناک چیز کا سوچ نہیں سکتا تھا۔ اور ہاں اس فیصلہ کے پہنچنے پر مجھے عرصہ لگ گیا"۔

یہی درحقیقت اس کے 'The Stanic Verses' لکھنے کی اصل وجہ تھی۔ باقی کا معاملہ جیسا کہ کہتے ہیں تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔

رشدیوں کی نئی نسل

اس حقیقت کو کوئی جھٹلا نہیں سکتا کہ 'دی سٹینک ورسز' کے واقعہ نے مزید رشدیوں کی نسل کو جنم دیا جو سیاسی اور فلمی دنیا سے اغلام بازوں اور ہم جنس پسندوں کی طرح پبلک میں آنا شروع ہو گئے۔ آیا یہ نئے رشدی اصلی رشدی کی حمایت میں آئے تھے یا یہ کہ رشدی کی طرح ان طاقتوں کے زیر اثر سامنے آئے تھے جن کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ یہ تمام کوششیں اس لئے کی گئیں تا کسی ہنگامے کا سامان پیدا کیا جائے تا اسلام اور مغرب کے درمیان خلیج پہلے سے وسیع تر ہو جائے۔ اسی ذہنیت کے چند ادیبوں کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے۔

ارشاد مانجی یوگنڈا میں پیدا ہونے والی ایشین ہے جو کینیڈا ہجرت کر گئی۔ اس نے 216 صفحات پر مشتمل کتاب (دی ٹربل ود اسلام) The Trouble With Islam لکھی جو نبی پاک آنحضور ﷺ کے خلاف بہتانوں کا انبار ہے۔ مانجی جس نے خود اپنے 'لیز بین' ہونے کا اعتراف کیا ہے وہ پوری دنیا میں اس موضوع پر لیکچر دے رہی ہے کہ اسلام میں کس طرح آزاد پسندی لائی جائے۔ اس کے سامعین میں ایمنسٹی انٹرنیشنل، یونائیٹڈ نیشن پریس کارپس، نیشنل کمیٹی آن امریکن فارن پالیسی، انٹرنیشنل وویمن فورم، سویڈش ڈیفینس ریسرچ ایجنسی، دی پینٹا گون، جین جیکسن روسو انسٹی ٹیوٹ، کیمبرج اور نوٹرڈیم یونیورسٹیاں شامل ہیں۔

امریکہ کی مشہور ترین پروگرام پیش کرنے والی اوپرا ون فری (Oprah Winfrey) نے اس کو اس کی جرأت، دلیری اور یقین کامل پر پہلا سالانہ چوتز پا ایوارڈ (Chutzpah Award) دیا۔ *Ms. Magazine* نے ارشاد کو اکیسویں صدی کی فیمینسٹ (عورتوں کے حقوق کے لئے لڑنے والی) قرار دیا۔ (میک لینز) *McLean's* کینیڈا کے نیشنل نیوز میگزین نے اس کا انتخاب بطور دس کینیڈین کے کیا "who can make a difference" یعنی جو تبدیلی لاسکتے ہیں۔

اس سے یہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ ایسے مصنفین جن کا پس منظر اسلامی ہو، جو اسلام پر کھلے بندوں تنقید کر سکتے ہوں ان کو شہرت پورے زور شور سے دی جاتی ہے تا ان کو بام عروج تک پہنچایا جاسکے تا وہ اکثریت والے مسلمانوں کے پہلے ہی زخم شدہ دلوں پر خوب نمک چھڑک سکیں۔

دیگر مصنفین جیسے تسلیمہ نسرین جو بنگلہ دیش کی مسلمان اور رشدی کی گہری دوست ہے اور جو شاید اس کا سرپرست بھی تھا وہ اسلام اور اس کے پاک پیغمبر ﷺ کے خلاف جذبات کو انگیخت کرنے والی کتابیں اور مضامین لکھ کر جلا وطنی میں زندگی گزار رہی ہے۔ تسلیمہ نسرین پر بھی بنگلہ دیش کے رجعت پسند مسلمانوں نے 1993ء میں فتویٰ جاری کیا تھا۔ ہتک خدا اور رسول کے کورٹ کیس اس کے خلاف بنگلہ دیش کی عدالتوں میں چل رہے ہیں۔ ایک مقدمہ تو بنگلہ دیش کی حکومت نے خود اس کے خلاف دائر کیا ہوا ہے۔

اس کے علاوہ دیگر کم شہرت اور اہمیت کے مصنفین بھی سامنے آئے ہیں۔ جب ان سب کو اکٹھا کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس سازش کے پیچھے کوئی بدشگون محرک ہے اور اس محرک کو جاننے کے لئے کسی کا تیز وطرّار ہونا ضروری نہیں ہے۔

کارٹون کا تنازعہ

اب حالیہ تنازعہ ڈینش کارٹون کا سامنے آیا ہے جس نے اسلام اور مغرب کے مابین سلگتی آگ کو ایک بار پھر سے ہوا دی ہے۔ ڈنمارک کے اخبار 'جے لینڈ پوسٹن' میں آنحضرت ﷺ کے خاکے شائع ہونے پر فروری 2006ء میں پوری دنیا میں مسلمانوں کی طرف سے غیر معمولی

احتجاج کا طوفان برپا ہوا۔ دلچسپی کی بات یہ ہے کہ یہی کارٹون ستمبر 2005ء میں ڈنمارک کے اخبار میں جب شائع ہوئے تو اس سے پوری دنیا میں صدائے احتجاج بلند نہ کی گئی جواب دیکھنے میں آئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کے پیچھے ضرور کوئی غلیظ شرارت کارفرما تھی۔ پہلی بار ستمبر 2005ء میں جب خاکے شائع ہوئے تو شرارت پسند اپنے مذموم مقاصد حاصل نہ کر سکے اس لئے انہوں نے انگریزی ذرائع ابلاغ میں ان کو شائع کر کے مسلمانوں کو زک کرنے کی بھرپور کوشش کی کیونکہ انگلش میڈیا کے پڑھنے والے تعداد میں زیادہ ہیں۔ مقام افسوس یہ ہے کہ سادہ لوح مسلمانوں کی اقلیت نے غیر اسلامی طریق سے مظاہرے کر کے ،قومی جھنڈے نذر آتش کر کے اور نہ صرف ڈینش حکومت کو دھمکیاں دے کر بلکہ تمام مغربی حکومتوں کو دھمکیاں دے کر شدید ردعمل کا اظہار کیا۔

اس واقعہ سے وہ زخم دوبارہ کھل گئے ہیں یا پہلے زخموں کو مزید گہرائی سے کاٹا گیا ہے جو کچھ کچھ مندمل ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اب مغربی سوسائٹی کے مؤثر اور معتبر افراد اور اسلامی دنیا کے مابین دوبارہ بحث وتمحیص شروع ہونی چاہئے تا پتہ لگایا جا سکے کہ آخر اصل معاملہ کیا ہے؟ اور یہ کہ بجائے منفی کے مثبت چیزوں کو سامنے رکھ کر صبر واستقلال سے صورت حال کا سیاق وسباق کے ساتھ جائزہ لیا جائے۔

منفی اور مثبت چیزیں دونوں اطراف سے آئیں گی۔ ایک طرف تو مغربی ذرائع ابلاغ کا سلسلہ مدارج ہے جو اب تک جو کچھ ہو چکا ہے اس پر بالکل نادم نہیں۔ وہ خود کو آزادی اظہار کے نعرے کے پردہ کے پیچھے چھپائے ہوئے ہیں۔ وہ رشدی جیسوں کو اس بات کی اجازت دے رہے ہیں کہ وہ لوگوں کے جذبات وعقائد کے ساتھ کھیلیں جو مسلمانوں کو بہت محبوب ہیں۔ دوسری طرف اسلامی دنیا سے مذہب کا دفاع کرنے والوں کی بڑھتی ہوئی تعداد ہے جنہوں نے اپنے نظریات کے پرچار میں تشدد سے نا قابل قبول حد تک کام لیا ہے۔ یہاں تک کہ 14 فروری 2006ء کو ایران کی انتہا پسند تنظیم شہداء فاؤنڈیشن نے سلمان رشدی پر لگے فتویٰ کی دوبارہ توثیق کر دی جو اس پر 1989ء میں لگایا گیا تھا اور اس کے سر کی قیمت 2.8$ ملین ڈالر کر دی۔

شہزادہ چارلس کا خطاب

مثبت امور میں برطانیہ میں ایسے اخبارات بھی ہیں جنہوں نے خاکے شائع کرنے سے صریحاً انکار کر دیا۔ شہزادہ چارلس نے اپنی اہلیہ کامیلا (Camilla) کے ساتھ مشرق وسطیٰ کے دورے کے دوران قابل مذمت خاکوں پر کڑی تنقید کی۔ مصر میں قیام کے دوران پرنس چارلس نے اس بات پر تشویش کا اظہار کیا کہ لوگ " سنتے کم ہیں اور ان امور کا احترام نہیں کرتے جو دوسروں کے نزدیک مقدس اور بیش قیمت ہیں"۔ پرنس نے یہ بات قاہرہ کی سب سے پرانی الازہر یونیورسٹی کے 800 مسلمان سکالرز کے سامنے 'Unity in Faith' کے موضوع پر تقریر کے دوران کہی۔ شہزادہ نے مختلف مذاہب کے مابین مزید تحمل ورواداری کی تلقین کی، خاص طور پر تین بڑے مذاہب یہودیت، عیسائیت اور اسلام جن کا تعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہے۔

" ہمارے مذاہب جن میں ہم سب شریک ہیں اس کی بنیادی جڑ یہ ہے کہ ہم سب ایک خدا پر یقین رکھتے ہیں، یعنی ابراہیمؑ کا خدا۔ یہ چیز ہمیں لازوال اقدار مہیا کرتی ہے۔ ہم میں اتنی جرأت ہونی چاہئے کہ ہم ان کا پرچار کریں، اور ان کا اقرار اس دنیا میں بار بار کریں جو مناقشت وتفرقہ میں گھری ہوئی ہے"۔ شہزادہ چارلس نے مزید کہا کہ: " ڈینش کارٹونوں پر جس قسم کے غم وغصہ اور تضاد کا مظاہرہ کیا گیا اس سے یہ کھل کر سامنے آ جاتا ہے کہ دوسروں کو نہ سننے کے کیا نقصانات ہیں نیز ان چیزوں کا احترام نہ کرنا جو دوسروں کے نزدیک مقدس ہیں۔ میرے خیال میں کسی مہذب معاشرے کی پہچان یہ ہے کہ وہ اقلیتوں اور اجنبیوں کا کس قدر احترام کرتا ہے"۔

شہزادہ چارلس نے مذہبی لیڈروں سے اپیل کی کہ وہ تحمل اور رواداری کے پرچار میں اپنا رول پوری طرح ادا کریں۔ " ہم سب کو رحم اور رحمدلی کے خدائی اوصاف کو سینے سے لگائے رکھنے کے علاوہ ان کا پرچار کرنا اور ان پر عمل کرنا ہوگا۔ اس کے لئے مکمل اطمینان اور مزاحمت سے باز رہنے کی ضرورت ہے۔ اور اگر مجھے کہنے کی اجازت ہو تو کہوں کہ وہ تمام افراد جو مختلف مذاہب میں کسی اعلیٰ پوزیشن یا اتھارٹی میں ہیں وہ کھل کر تواتر کے ساتھ خدائی اوصاف کی بے پایاں اقدار کی تشہیر کریں"۔

ارشادات امام جماعت احمدیہ

اسلامی دنیا کی طرف سے سب سے زیادہ مؤثر اور زوردار جواب حضرت مرزا مسرور احمد خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ نے دیا جو جماعت احمدیہ عالمگیر کے روحانی سربراہ ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ یہی وقت ہے کہ جملہ مذاہب کے لیڈروں کو حساس مذہبی معاملات پر حملوں کے خلاف اتحاد کا مظاہرہ کرنا چاہیئے۔ انہوں نے برطانیہ کے میڈیا کو مبارکباد دی کہ کس طرح انہوں نے اس قابل افسوس تنازعہ میں کوئی بھی کارٹون نہ شائع کر کے نہایت ذمہ داری کا ثبوت دیا۔

آپ نے فرمایا: ''آج کل ڈنمارک اور مغرب کے بعض ممالک میں آنحضرت ﷺ کے بارہ میں انتہائی غلیظ اور مسلمانوں کے جذبات کو انگیخت کرنے والے، ابھارنے والے، کارٹون اخباروں میں شائع کرنے پر تمام اسلامی دنیا میں غم و غصے کی ایک لہر دوڑ رہی ہے اور ہر مسلمان کی طرف سے اس بارے میں ردعمل کا اظہار ہو رہا ہے۔ بہرحال قدرتی طور پر اس حرکت پر ردعمل کا اظہار ہونا چاہیئے تھا......لیکن جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ ہمارا ردعمل کبھی ہڑتالوں کی صورت میں نہیں ہوتا اور نہ آگیں لگانے کی صورت میں ہوتا ہے اور نہ ہی ہڑتالیں اور توڑ پھوڑ، جھنڈے جلانا اس کا علاج ہے۔''

''ہمارا ردعمل ہمیشہ ایسا ہوتا ہے اور ہونا چاہیئے جس سے آنحضرت ﷺ کی تعلیم اور اسوہ نکھر کر سامنے آئے۔ قرآن کریم کی تعلیم نکھر کر سامنے آئے۔ آنحضرت ﷺ کی ذات پر ناپاک حملے دیکھ کر بجائے تخریبی کاروائیاں کرنے کے اللہ تعالیٰ کے حضور جھکتے ہوئے اس سے مدد مانگنے والے ہم بنتے ہیں۔''

''جیسا کہ میں نے کہا یہ ستمبر کی حرکت ہے یا اکتوبر کے شروع کی کہہ لیں۔ تو ہمارے مبلغ نے اس وقت فوری طور پر ایک تفصیلی مضمون تیار کیا اور جس اخبار میں کارٹون شائع ہوئے تھے ان کو بھجوایا اور ان خاکوں کی اشاعت پر احتجاج کیا۔ ہم جلوس تو نہیں نکالیں گے لیکن قلم کا جہاد ہے جو ہم تمہارے ساتھ کریں گے۔ اور خاکوں کی اشاعت پر اظہار افسوس کرتے ہیں۔ اس کو بتایا کہ ضمیر کی آزادی تو ہوگی لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ دوسروں کی دلآزاری کی جائے۔ بہرحال اس کا مثبت ردعمل ہوا۔ ایک مضمون بھی اخبار کو بھیجا گیا تھا جو اخبار نے شائع کر دیا۔ ڈینش عوام کی طرف سے بڑا اچھا ردعمل ہوا کیونکہ مشن میں بذریعہ فون اور خطوط بھی انہوں نے ہمارے مضمون کو کافی پسند کیا، پیغام آئے۔''

’’آنحضرت ﷺ کی ذات پر جب حملہ ہوتو وقتی جوش کی بجائے، جھنڈے جلانے کی بجائے،توڑ پھوڑ کرنے کی بجائے،ایمبسیوں پر حملے کرنے کی بجائے اپنے عملوں کودرست کریں کہ غیر کوانگلی اٹھانے کا موقعہ ہی نہ ملے۔کیا یہ آگیں لگانے سے سمجھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی عزت اور مقام کی نعوذ باللہ صرف اتنی قدر ہے کہ جھنڈے جلانے سے یا کسی سفارتخانے کا سامان جلانے سے بدلہ لیا جائے۔نہیں ہم تو اس نبی کے ماننے والے ہیں جوآگ بجھانے آیا تھا،وہ محبت کا سفیر بن کرآیا تھا،وہ امن کا شہزادہ تھا۔پس کسی بھی سخت اقدام کی بجائے دنیا کو سمجھائیں اورآپؐ کی خوبصورت تعلیم کے بارے میں بتائیں............ یہ پانچ منٹ کی آگ تو بجھ جائیگی ہماری آگ توایسی ہونی چاہئے جو ہمیشہ لگی رہنے والی آگ ہو۔وہ آگ ہے آنحضرت ﷺ سے عشق ومحبت کی آگ جوآپ کے ہراسوہ کو اپنانے اور دنیا کو دکھانے کی آگ ہو جوآپ کے دلوں اور سینوں میں لگےتو پھرلگی رہے۔یہ آگ ایسی ہو جو دعاؤں میں بھی ڈھلے اوراس کے شعلے ہر دم آسمان تک پہنچتے رہیں۔‘‘

اسی طرح آپ نے فرمایا کہ:

’’مختلف قومیّتوں کے درمیان مل جل کر کام کرنے کا یہی طریقہ ہے تا عالمی امن اور مصالحت قائم کی جا سکے۔اس سے پہلے بھی رشدی ہوگزرے ہیں اور میں یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ مستقبل میں بھی رشدی جیسے پیدا ہوں گے جو مناقشت اور بدامنی پیدا کرنے کی کوشش کریں گے کیونکہ ان کی فطرت ہی گندی ہے۔لیکن ہر وہ شیطان رشدی جو اپنا ذلیل ومکروہ سر اٹھانے کی جرأت کرے گا اس کے جواب میں ہزاروں ہزار ایسے شریف النفس انسان بھی ہوں گے جو ان گستاخیوں کا عقلی طریقے سے باہمی گفتگو کے ذریعہ جواب دیں گے۔اور ایسے ملین درملین افراد بھی ہوں گے جو پیغمبر اسلام نبی پاک ﷺ پر دن رات ہمیشہ درود بھیجتے رہیں گے۔مجھے یقین واثق ہے کہ ایک روز پوری دنیا لازماً ہمارے پیارے نبی ﷺ کی مبارک بعثت کی صحیح وجہ جان لے گی۔ اور وہ وجہ یہ تھی کہ پوری نوع انسانی کو ایک جھنڈے تلے جمع کیا جائے یعنی اسلام کے جھنڈے تلے جس کے معنی ہیں امن وآشتی۔آمین‘‘

(تفصیل کے لئے مطالعہ فرمائیں "اسوۂ رسول ﷺ اور خاکوں کی حقیقت" از حضرت مرزا مسرور احمد خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز[ISBN: 1 85372 908 6])

رشدی کے بیانات

فروری 1989ء

☆ اگر آپ کسی کتاب کا مطالعہ نہیں کرنا چاہتے، تو آپ کو اس کے مطالعہ پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ یہ غیر ممکن ہے کہ کسی کے جذبات دی سٹینک ورسز سے انگیخت ہوں۔

☆ دی سٹینک ورسز اسلام پر حملہ نہ تھا اور نہ ہی کسی اور مذہب پر۔

☆ سچی بات تو یہ ہے کہ کاش میں نے اس سے زیادہ تنقیدی کتاب لکھی ہوتی ......ایسا لگتا ہے کہ اسلامی بنیاد پرستی کو اس وقت تھوڑی تنقید کی ضرورت ہے۔

☆ دی سٹینک ورسز کے مصنف کی حیثیت سے مجھے اس بات کا شدید احساس ہے کہ دنیا کے کئی ممالک میں مسلمان میرے ناول کی اشاعت سے دلی طور پر دلگیر ہوئے ہیں ......ہم سب کو دوسروں کے احساسات کا خیال رکھنا چاہئے۔

☆ اگرچہ میرا تعلق مسلمان گھرانے سے ہے لیکن میری پرورش بحیثیت مسلمان کے نہ ہوئی تھی ...... لیکن اب میں اقرار کرتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں۔

☆ میں اسلام کا صحیح چہرہ دنیا میں پیش کرنے کیلئے تندہی سے کام کرتا رہوں گا جیسا کہ میں نے ماضی میں ایسا کرنیکی کوشش کی ہے۔

فروری 1992ء

☆ کسی کی دلآزاری کرنا کبھی بھی کسی آزاد معاشرہ میں پابندی کی وجہ نہیں ہونی چاہئے۔

☆ کاش کہ (برطانوی) حکومت میرے لئے یہ یقین کرنا آسان بنادے کہ وہ پورے زور اور عزم کے ساتھ میری پشت پر ہے۔

اگست1995ء

☆ *The Stanic Verses* ایک سنجیدہ ناول، ایک اخلاقی ناول ہے...... یہ نہ تو فحش نہ ہی ذلت آمیز اور نہ ہی دشنام طراز ہے...... یہ تو ورک آف آرٹ ہے۔

ستمبر/اکتوبر1995ء

☆ ہم مذہبی راہنماؤں کو اس بات کی اجازت نہ دیں گے کہ وہ ہمیں حکم دیں کہ ہم کب اپنا منہ بند کر دیں۔ ...... ہمارے فرض منصبی کا ایک حصہ یہ ہے کہ ہلچل اور ہیجان برپا کیا جائے۔

☆ اگر انسان خطرہ مول نہ لے تو پھر انسان کبھی کوئی دلچسپ کام نہیں کر سکتا۔

شرح الفاظ

عبداللہ ابن ابی	مدینہ کے خزرج قبیلہ کا سردار۔ رسول اللہ ﷺ کی مدینہ آمد سے قبل اس کا شہر کا لیڈر بننا متوقع تھا۔ منافقوں کا سردار
احمدی	جماعت احمدیہ عالمگیر کا رکن
جماعت احمدیہ	ایک مسلمان فرقہ جس کا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت میرزا غلام احمد (علیہ السلام) مسیح موعود و مہدی معہود ہیں۔
عائشہؓ	حضرت ابوبکرؓ کی دختر نیک اختر، نبی کریم ﷺ کی زوجہ مطہرہ
اللہ	عربی زبان میں خدا کا ذاتی نام
انصار	ہجرت کے وقت مدینہ کے مسلمان شہری
آریہ	ہندوستان کا ایک تشدد پسند ہندو فرقہ
آیت اللہ خمینی	ایران کے انقلابی لیڈر جن کا پہلا نام روح اللہ موساوی تھا۔
عزرائیل	موت کا فرشتہ
بنو قریظہ	رسول اللہ ﷺ کی مدینہ آمد سے قبل یہاں کا ایک یہودی قبیلہ
بلالؓ	ایک غلام جن کو حضرت ابوبکرؓ نے آزاد کروایا۔ اسلام کے سب سے پہلے مؤذن۔
برقعہ	لباس جو بعض ممالک میں مسلمان خواتین پردہ کے لئے اور اپنے آپ کو ڈھانپنے کے لئے پہنتی ہیں۔
مہاجر	مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آنیوالے مسلمان
عیدالفطر	روزوں کے اختتام پر منایا جانیوالا اسلامی تہوار
فتویٰ	مذہبی حکم یا فرمان
جبرائیل	اللہ تعالیٰ کا خاص فرشتہ جو رسولوں پر خدا تعالیٰ کی وحی لاتا رہا نیز رسول اللہ ﷺ کے پاس وحی لانیوالا فرشتہ

حدیث	رسول پاک ﷺ کی بیان کردہ بات
حلال	اسلامی قانون کے مطابق جس کی اجازت ہو۔
حمزہؓ	نبی کریم ﷺ کے چچا محترم جنہوں نے اسلام قبول کیا اور جن کی شہادت جنگ احد کے موقعہ پر ہوئی
حجاب	دی سٹینک ورسز میں بیان کردہ رنڈی خانہ جونعوذ باللہ مکہ میں تھا
ہندو	ہندو مذہب کے پیروکار جوزیادہ تر ہندوستان میں پائے جاتے ہیں
قرآن مجید	مسلمانوں کی مقدس کتاب جس کا ہر لفظ رسول اللہ پر وحی کے ذریعہ نازل ہوا تھا۔
حور	جنت میں مومنین کو ملنے والے نازک بدن نیک اور صالح ساتھی۔ تمثیلی بیان ہے۔
جاہلیہ	فخر الانبیاء ﷺ کی بعثت سے قبل کا دور۔
جہاد	اعلیٰ مقصد کے حصول کے لئے کوشش کرنا۔ اپنے دفاع میں لڑی جانیوالی جنگ، اس کی ایک قسم جہاد بالنفس ہے۔
کعبہ	دنیا میں خدائے واحد کی عبادت کیلئے بنایا جانیوالا پہلا گھر جو مکہ میں ہے
خدیجہ	رسول اللہ ﷺ کی پہلی زوجہ مطہرہ
خالدؓ بن ولید	اسلام کا بہترین جنگی ہیرو اور جرنیل جن کا لقب سیف اللہ تھا۔
خلیفہ	نبی اللہ یا پیغمبر کا جانشین، گدی نشین، مسلمانوں کی ایک ذات یا خاندانی نام۔
لات	ایک عرب دیوی جس کا بت طائف کے عبادت خانے میں تھا۔
محمد (ﷺ)	اسلام کے پیغمبر
مہدی	رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث کے مطابق آخری زمانے میں آنیوالا شخص جو دین کی تجدید کرے گا۔
ماہونڈ	ایک جھوٹا دیوتا۔ ایک بت۔ ایک عفریت۔ ایک بھیانک مخلوق۔ شیطان کا نام۔ مغربی مستشرقین کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کو دیا جانیوالا اہانت آمیز نام۔
منات	اسلام سے قبل کی ایک دیوی جس کا عبادت خانہ بحیرہ احمر کے کنارے قدید شہر میں تھا۔

مارٹن لوتھر	سولھویں صدی میں جرمنی کے ملک میں لوتھرن چرچ کا بانی۔
مکہ	سعودی عرب کا شہر جہاں رسول اللہ ﷺ کی ولادت ہوئی۔
مدینہ	سعودی عرب کا شہر جس کا پرانا نام یثرب تھا، مکہ سے 424 کیلومیٹر شمال میں۔
غارحرا	مکہ سے تین میل دور پہاڑی پر واقع غار جہاں رسول اللہ ﷺ پر پہلی وحی نازل ہوئی۔
مؤذن	وہ شخص جو نماز سے پہلے مومنوں کو نماز ادا کرنے کیلئے بلاتا ہے۔
مغل	ہندوستان پر برطانوی حکومت سے قبل مغلیہ سلطنت کے بادشاہ۔
ملاء	مسلمان مذہبی لیڈر
پارٹیشن	1947ء کا زمانہ جب برصغیر ہندوستان پاکستان اور بھارت میں تقسیم ہوا تھا اور برطانیہ سے آزادی ملی تھی۔
مسیح موعود	آخری زمانہ میں آنیوالا مجدد اور مسیح جس کی آمد کی پیشگوئی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور رسول اللہ ﷺ نے فرمائی تھی۔ یہ لقب مرزا غلام احمد قادیانیؑ کیلئے استعمال ہوتا ہے جنہوں نے دعویٰ کیا کہ ان کا ظہور ان پیشگوئیوں کے مطابق ہوا۔
پردہ	اسلامی ممالک میں مردوں اور عورتوں کا الگ بیٹھنا۔ یا عورتوں کا کپڑوں کے اوپر حجاب پہننا۔
قریش	عرب کا قبیلہ، یہ لوگ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے تھے۔ رسول اللہ ﷺ اس قبیلہ سے تھے۔
صفوان	حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ایک خادم
صحیح بخاری	حدیث کی چھ مستند کتابوں میں سے سب سے مستند کتاب جس کو امام اسماعیل بخاریؒ نے تالیف کیا تھا۔
صلاح الدین	1169ء میں مصر اور شام کا سلطان، فاتح یروشلم۔
سورت	قرآن پاک کا ایک حصہ
سلمان فارسیؓ	رسول اللہ ﷺ کے صحابی جو فارس سے عرب آئے تھے۔

شیطان	ایسی ہستی جو انسان کو بہکاتی ہے۔ سب سے بڑے شیطان کا نام ابلیس ہے۔
ترمذی	حدیث کی چھ کتابوں میں سے ایک کتاب
محمد بن جریر الطبری	مسلمان مؤرخ
طالمود	یہودیوں کے مذہبی اور عائلی قوانین کا مجموعہ
علماء	مسلمانوں کے مذہبی سکالرز
عمرؓ	حضرت عمر بن الخطابؓ، رسول اللہ ﷺ کے دوسرے خلیفہ۔
عزیٰ	عرب دیوی جس کی قربان گاہ نخلہ (مکہ کے قریب) کی وادی میں تھی۔
زید بن حارثؓ	رسول اللہ ﷺ کے منہ بولے بیٹے اور آزاد کردہ غلام
زینب بنت حارثہؓ	زید بن حارث کی طلاق شدہ بیوی جس کی شادی بعد میں رسول اللہ ﷺ سے قرار پائی تھی۔
ذوالفقار علی	زیڈ اے بھٹو، پاکستان کا صدر 1971ء تا 1977ء
ضیاء الحق	پاکستان کا صدر 1977ء تا 1988ء
زرقانی	شرح زرقانی جس کے مصنف مشہور مسلمان مؤرخ محمد ابن عبد الباقی الزرقانی تھے۔

مصادر

1. VICTORY OF ISLAM, Hadhrat Mirza Ghulam Ahmad, 1890 English edition, Tameerr Press, Lahore, Pakistan 1973.
2. MUHAMMAD SEAL OF THE PROPHETS, Muhammad Zafrulla Khan, Routledge & Kegan Paul, London 1980.
3. CHRISTIANITY AND THE WORLD RELIGIONS, Hans Kung, Williams Collins & Co Ltd, London 1987.
4. THE RISE OF CHRISTIAN EUROPE, Hugh Trevor-Roper, Thames and Hudson, London 1965.
5. TREASON AGAINST GOD, Leonard W Levy, Schocken Books, London 1981.
6. MOHAMMED, Maxime Rodinson, 1961, English edn., Allen Lane, The Penguin Press, London 1971.
7. ISLAM: A CHRISTIAN PERSPECTIVE,Michael Nazir-Ali, The Paternoster Press, Exeter 1983.
8. MUSLIM-CHRISTIAN ENCOUNTERS, William Montgomery Watt, Routledge, London 1991.
9. ISLAMIC FUNDAMENTALISM AND MODERNITY, Professor W M Watt, Routledge, London 1988.
10. MUHAMMAD AT MEDINA, W Montgomery Watt, The Clarendon Press, Oxford 1956.
11. ISLAM AND THE WEST, Norman Daniel, The University Press, Edinburgh 1958.
12. MUHAMMAD, A WESTERN ATTEMPT TO UNDERSTAND ISLAM, Karen Armstrong, Victor Gollancz Ltd, London 1991.
13. THE SATANIC VERSES, Salman Rushdie, Viking Penguin 1988.
14. GRIMUS, Salman Rushdie, Victor Gollancz Ltd, London 1975.
15. MIDNIGHT'S CHILDREN, Salman Rushdie, Jonathan Cape Ltd, London 1981.

16. SHAME, Salman Rushdie, Jonathan Cape Ltd, London 1983.
17. HAROUN AND THE SEA OF STORIES, Salman Rushdie, Granta Books, London 1990.
18. EAST, WEST, Salman Rushdie, Jonathan Cape Ltd, London 1994.
19. THE WATERSTONE'S MAGAZINE, a quarterly magazine published by Waterstone's Booksellers, UK.
20. MUHAMMAD, Martin Lings, George Allen & Unwin, London 1983.
21. TRANSFORMING LIGHT, Albert and E Vail, Jasper & Row1970.
22. WORLD'S HISTORY, Rodney Castleden, Parragon 1994.
23. THE MOORS IN SPAIN, Stanley Lane-Poole, Darf Publishers Ltd, London 1984.
24. STRUCTURE OF SPANISH HISTORY, Americo Castro (p.170)
25. A HISTORY OF THE CRUSADES, Sir Steve Runciman Harmondsworth, Penguin 1965.
26. LA GUERRE ET LE GOUVERNEMENT DE L'ALGERIE, M Baudricourt, Paris 1853.
27. POLEMIQUE BYZANTINE CONTRE L'ISLAM, Adel-Theodore Khoury, Leiden : Brill 1972.
28. LOVE AND LIVING, Thomas Merton, Bantam Books, New York 1980.
29. THE SPIRIT OF ISLAM, Ameer Ali Syed 1873.
30. MODERN TRENDS IN ISLAM, Sir Hamilton Gibb, University of Chicago Press 1947.
31. AN INTERPRETATION OF ISLAM, Professor Laura Veccia Vaglieri.
32. DE RELIGIONE MOHAMMEDICA, Adrian Reland 1705.
33. THE TALMUD UNMASKED, Rev I B Pranaitis.
34. ASH WEDNESDAY SUPPER, Giordano Bruno 1584, English edition, William Boulting 1914.
35. ISLAM AND MODERN HISTORY, Wilfred Cantwell Smith 1956.

NEWSPAPERS

1.	THE TIMES	Published in the UK
2.	THE SUNDAY TIMES	Published in the UK
3.	THE TIMES MAGAZINE	Published in the UK
4.	THE INDEPENDENT	Published in the UK
5.	THE INDEPENDENT ON SUNDAY	Published in the UK
6.	THE GUARDIAN	Published in the UK
7.	THE DAILY TELEGRAPH	Published in the UK
8.	THE WASHINGTON TIMES	Published in the USA
9.	THE NEW YORK TIMES	Published in the USA

BRITISH TELEVISION STATIONS

BBC 2	BRITISH BROADCASTING CORPORATION
ITV	INDEPENDENT TELEVISION
CHANNEL 4	PART OF ITV

مصنف کا تعارف

محمد ارشد احمدی کینیا (مشرقی افریقہ) میں 1952ء میں پیدا ہوئے۔ اپنی تعلیم مکمل کرنے کی غرض سے آپ پندرہ سال کی عمر میں برطانیہ تشریف لائے۔ مشرقی افریقہ میں ایشین لوگوں کے 1960ء کی دہائی کے آخر میں انخلاء کے وقت جب آپ کے والدین بھی برطانیہ ہجرت کر آئے تو پھر آپ نے یہاں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

محمد ارشد احمدی جماعت احمدیہ برطانیہ کے معروف رکن ہیں۔ آپ نے جماعت احمدیہ کی انتظامیہ میں مختلف عہدوں پر کام کیا ہے اور تادم تحریر آپ نیشنل سیکرٹری اشاعت ہیں۔ آپ نے بہت سی میراتھن واکس میں بطور منتظم کام کیا ہے۔ ایک سائیکل میراتھن کے انتظام میں بھی آپ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جس میں برطانیہ کی جملہ چیریٹیز کے لئے ہزاروں پاؤنڈز اکٹھے کئے گئے تھے بشمول امپیریل کینسر ریسرچ اور گریٹ اورمنڈ سٹریٹ ہاسپٹل۔

ارشد احمدی کو بین المذاہب مطالعہ میں ہمیشہ سے رغبت رہی ہے۔ مغربی تہذیب میں مسلمانوں کے مدغم ہونے کے موضوع پر آپ نے مختلف مواقع پر لیکچر دیئے ہیں۔ گذشتہ کئی سالوں سے آپ اسلام، نصرانیت اور یہودیت پر ریسرچ کرتے آ رہے ہیں اور حال ہی میں انہوں نے رسوائے زمانہ کتاب *The Stanic Verses* کا دندان شکن جواب لکھنے میں اپنا وقت صرف کیا ہے۔

پیشہ کے لحاظ سے آپ فارماسوٹیکل انڈسٹری میں بطور کنسلٹنٹ کام کرتے آ رہے ہیں۔ آپ کے تین بچے ہیں۔ آپ زبردست کھلاڑی ہیں خاص طور پر ہاکی، سکواش اور ٹینس کی کھیلوں میں آپ کی دلچسپی زیادہ ہے۔